www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

January-February 2024 • Rs. 40

زندگی کے مسائل کا حل خدا نے سنجیدہ غور وفکر اور حقیقت پسندانہ
منصوبہ بندی میں رکھا ہے، نہ کہ بے فائدہ احتجاج اور ٹکراؤ میں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Jan-Feb, 2024 | Volume 49 | Issue 1

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 40 per copy
Subscription by Book Post	₹ 200 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Al-Risala Monthly
Punjab National Bank
A/c No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

جنگ نہیں 4
گزرا ہوا زمانہ 6
ایک حدیث 8
علم اور تقویٰ 9
جنت کا مسافر 10
سفرِ معرفت 11
مطالعۂ حدیث (شرح مشکوۃ المصابیح) 15
انتہا پسندی 24
اجتہاد کیا ہے 25
سمتِ سفر 27
اصل مسئلہ 28
ایک سوال 31
سپریم چیز 32
ڈائری 1986 34
زندگی کے قیمتی سال 47
خبرنامہ اسلامی مرکز—281 48

रहमत वाले नबी का तरीक़ा 1
नफ़रत, मुहब्बत 2
मुक़ाम कैसे मिला? 6
दावत का काम सबसे ज़्यादा क़ीमती है 8
इज्तिमाई ज़िन्दगी हर हाल में ज़रूरी 8
बोलने का तरीक़ा 9
एक सुन्नत 10
दो इमकानात के दरमयान 11
ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब 12
मे’यार को बुलन्द करना 15
कम बोलना, किसी से शिकायत न होना 16
जिसकी शरारत का असर उसके बाद भी रहे 16

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

جنگ نہیں

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (8:25)۔ یعنی، اورتم لوگ بچو ایک ایسے فتنہ سے جو ہرگز محدود نہیں رہے گا (صرف) ان لوگوں تک جنھوں نے ظلم کیا ہے۔ علامہ ابن الجوزی (وفات 1201ء) کہتے ہیں کہ اس آیت میں فتنہ کا ایک مطلب علما کے نزدیک قتال بھی ہے (زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 201)، یعنی جنگ۔

علامہ واحدی نیشاپوری (وفات 1076ء) نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ ہر اس فتنے سے دور رہو کہ اگر تم اس کو اوائڈ نہیں کرو گے تو اس کا سنگین نتیجہ تم میں سے صرف فتنہ بھڑکانے والے ظالموں تک محدود نہیں رہے گا (لا تقع بالظّالمین دون غیرھم) بلکہ فتنہ بھڑکانے والے اور نہ بھڑکانے والے ہر ایک اس کی لپیٹ میں آجائیں گے (الوجیز للواحدی، صفحہ 436)۔

جدید جنگی آلات کے ذریعہ لڑی جانے والی جنگ اس آیت کی واضح مثال ہے۔ نئی دہلی میں ایک صاحب میڈیکل ٹورزم کی فیلڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے ایک مرتبہ میں نے یہ پوچھا کہ افغانستان، عراق، شام اور یمن وغیرہ میں جو طویل عرصے تک جنگ ہوئی ہے، وہاں کی عوام کی صحت پر اس کا کیا اثر دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے جو جواب دیا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت برا اثر ہوا ہے۔ بارود اور دوسرے کیمیائی ہتھیاروں (chemical weapons) کے استعمال کی وجہ سے ان ملکوں میں بستی کی بستی کینسر اور دوسری سنگین بیماریوں کی لپیٹ میں آچکی ہیں۔ حالاں کہ عام لوگوں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ جسمانی معذوری تو بہت زیادہ عام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم دور کی جنگ کا نقصان عام طور پر صرف لڑنے والوں کے درمیان رہتا تھا، مگر جدید جنگی آلات، خاص طور پر ویپنز آف ماس ڈسٹرکشن نے جنگ کا مطلب بالکل بدل دیا ہے۔ میں نے چیٹ جی پی ٹی (ChatGPT) پر یہ سوال پوچھا کہ ماڈرن وار کا اثر کیا ہوتا ہے تو اس نے یہ جواب دیا ہے۔

Q. What is the impact of modern warfare?

A. Modern warfare has a profound impact on societies, individuals, and the world as a whole. Some key impacts include:

1. **Loss of Life:** War results in the loss of countless lives, including soldiers and civilians. Modern weaponry can cause mass casualties, leading to human suffering on a massive scale.
2. **Physical and Psychological Trauma:** Survivors of war often suffer physical injuries, but they may also experience long-lasting psychological trauma, such as post-traumatic stress disorder (PTSD).
3. **Destruction:** Modern warfare can devastate infrastructure, cities, and economies. The reconstruction of war-torn regions can take years or even decades.
4. **Displacement:** War leads to the displacement of millions of people, creating refugee crises and straining resources in neighboring countries.
5. **Economic Consequences:** War has negative economic impacts, both on the countries directly involved and on the global economy. It diverts resources away from productive endeavors.
6. **Political Instability:** Wars can lead to political instability, regime changes, and the emergence of new power dynamics in regions.
7. **Environmental Damage:** Modern warfare often involves the use of environmentally harmful technologies and can lead to environmental degradation and long-term ecological consequences.
8. **Social and Cultural Disruption:** War can disrupt social structures and cultural norms, leading to societal breakdown and loss of cultural heritage.
9. **Technological Advancements:** Ironically, modern warfare drives technological advancements, as nations invest in research and development to gain a military edge.
10. **Global Impact:** Wars in one part of the world can have ripple effects globally, affecting international relations, alliances, and security policies. It is important to note that the impact of modern warfare is highly complex and multifaceted, and efforts to prevent and mitigate the consequences of armed conflict are of utmost importance. (accesed on 19.10.2023) Prof. Farida Khanam

گزرا ہوا زمانہ

قرآن کی سورہ عصر کا ترجمہ یہ ہے: قسم ہے زمانہ کی۔ بے شک انسان بڑے خسارہ میں ہے، سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی (103:1-3)۔

عصر کا مطلب ہے گزرا ہوا زمانہ۔ ''گزرتے ہوئے'' زمانہ میں انسان ایک ''ٹھہری ہوئی'' مخلوق ہے۔ وہ بقیہ کائنات کے سرگرم قافلہ کے ساتھ لازمی طور پر بندھا ہوا نہیں ہے۔ انسانی زندگی کی یہ آزاد نوعیت بتاتی ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کے لیے آدمی کو بالارادہ کوشش کرنا ہے، جب کہ ناکامی اس کی طرف اپنے آپ چلی آرہی ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ سورہ عصر کا مطلب میں نے ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ اس کی پکار کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جس طرح برف پگھل کر کم ہوتا رہتا ہے، اسی طرح انسان کو ملی ہوئی عمر بھی تیزی سے گزر رہی ہے۔ عمر کا موقع اگر بے عملی یا برے کاموں میں کھو دیا جائے تو یہی انسان کا گھاٹا ہے (تفسیر رازی، جلد 32، ص 278)۔

انسان اپنی گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ آخرت کے ابدی انجام کی طرف چلا جا رہا ہے۔ وہ ایسے فیصلہ کن مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں کامیابی صرف اس شخص کے لیے ہے جس نے اپنے عمل سے اس کا استحقاق پیدا کیا ہو۔ جو شخص عملی استحقاق کے بغیر وہاں پہونچے اس کے لیے آخرت کے دن ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ دنیا ایک انتہائی مکمل دنیا ہے۔ یہاں انتہائی بامعنی قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اور یہ سب کچھ ایک پابند نظام کے تحت ہو رہا ہے۔ وسیع کائنات اپنے بے شمار اجزاء کے ساتھ ایک زبردست خدائی قانون میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہر چیز ٹھیک وہی کرنے پر مجبور ہے جس کے لیے اس کو بنایا گیا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ انسان، دوسری تمام چیزوں کے برعکس،

بالکل آزاد ہے۔یعنی انسان کی فلاح بھی تمام تر اسی میں ہے کہ وہ بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔ تاہم اللہ کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق، کائناتی طریقہ کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ تمام تر اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے، وہ چاہے تو اس کو اپنائے اور چاہے تو نہ اپنائے۔

کائنات کے مقابلہ میں انسان کی مثال ایسی ہے جیسے ٹرین کے مقابلہ میں اسٹیشن پر کھڑے ہوئے مسافر کی۔ٹرین اپنے تمام اجزاء سمیت انجن کے ساتھ بھاگی چلی جارہی ہے۔ٹرین کا ہر ڈبہ انجن سے بندھا ہوا ریل کی پٹری پر دوڑ رہا ہے۔مگر مسافر اور ڈبہ میں یہ فرق ہے کہ ڈبہ تو انجن سے بندھا ہوا اپنے آپ چلا جارہا ہے۔مگر انسان اس وقت ٹرین کا مسافر بنتا ہے جب کہ وہ بالقصد اپنے آپ کو اس کے اندر داخل کرکے اس کا شریک سفر بننے پر راضی ہوجائے۔گویا انسان کو ٹرین کا ہم سفر بننے کے لیے تو ارادی عمل کی ضرورت ہے مگر ٹرین سے بچھڑنے کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ بچھڑنے کا واقعہ اپنے آپ ہورہا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے برف پگھل کر ختم ہونے کا واقعہ اپنے آپ ہورہا ہے۔مگر اس کو بیچ کر اس سے نفع حاصل کرنے کے لیے بالقصد عمل کی ضرورت ہے۔ یا جیسے کسی طالب علم کے امتحان میں ناکام ہونے کے لیے تو صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کچھ نہ کرے۔ لیکن اگر وہ کامیاب ہونا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ امتحان کے نظام میں اپنے آپ کو شریک کرے اور ان تقاضوں کو پورا کرے جو تعلیم کے ذمہ داروں نے مقرر کیا ہے۔

انسان کی زندگی کا زیادہ بڑا حصہ وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والا ہے۔موت سے پہلے کی زندگی اس کے پورے عرصہ حیات کا محض ایک ابتدائی وقفہ ہے۔یہی مختصر وقت انسان کا اصل سرمایہ ہے۔کیوں کہ اسی پر اس کی آئندہ آنے والی طویل تر زندگی کا فیصلہ ہونا ہے۔

اس محدود مدت کو صحیح طور پر استعمال کرنا انتہائی ضروری ہے۔اس میں معمولی غفلت بھی ناقابل تلافی نقصان کی صورت میں انسان کو بھگتنی پڑے گی۔اس کو صحیح استعمال کرنے والا کون ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو موجودہ دنیا میں تین باتوں کا ثبوت دے سکے۔ایک وہ جس کو ایمان کہا جاتا ہے۔یعنی حقیقت کا شعور اور اس کا اعتراف۔دوسرے عمل صالح۔یعنی وہی کرنا جو خالق کی اسکیم آف تھنگس کے مطابق درست ہو اور وہ نہ کرنا جو خالق کی اسکیم آف تھنگس کے مطابق درست نہ ہو۔تیسرے حق وصبر کی تواصی۔یعنی سچائی کا ادراک اتنا گہرا ہو کہ آدمی اس کا داعی اور مبلغ بن جائے۔

ایک حدیث

ایک حدیث قدسی ان الفاظ میں آئی ہے: إِنَّ اللّٰہَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى إِذَا أَحَبَّ عَبْدًا نَادَى جِبْرِيلَ: إِنَّ اللّٰہَ قَدْ أَحَبَّ فُلاَنًا فَأَحِبَّهُ، فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، ثُمَّ يُنَادِي جِبْرِيلُ فِي السَّمَاءِ: إِنَّ اللّٰہَ قَدْ أَحَبَّ فُلاَنًا فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، وَيُوضَعُ لَهُ القَبُولُ فِي أَهْلِ الأَرْضِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7485)۔ یعنی بیشک اللہ تعالی جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے، وہ جبریل کو کہتا ہے: بیشک اللہ نے فلاں سے محبت کی ہے، توتم بھی اس سے محبت کرو۔ تو جبریل اس سے محبت کرتے ہیں، پھر جبریل آسمان میں آواز لگاتے ہیں بیشک اللہ نے فلاں سے محبت کی ہے، توتم لوگ اس سے محبت کرو، تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، اوراس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔

میرے اندازے کے مطابق، یہ حدیث لفظی معنی (literal meaning) میں نہیں ہے، بلکہ وہ تمثیل کی زبان میں ہے۔ اس واقعہ کو تمثیل کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اصل میں اس حدیث میں فطرت کے ایک واقعے کو تمثیل کی زبان میں بیان کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جب کوئی انسان خدا سے ڈرنے والا بن جاتا ہے تو اس کے دل میں اللہ کے بندوں سے محبت ہوجاتی ہے۔ وہ اللہ کے بندوں کے لیے دعائیں کرتا ہے۔ اس طرح کا عمل اگرکسی انسان کے اندر پیدا ہوجائے تو وہ یک طرفہ نہیں رہتا۔ وہ سفر کرکے دوسرے انسانوں تک پہنچتا ہے۔ جب ایک طرف سے یہ واقعہ ہوتا ہے تو دوسرے انسان کی طرف سے بھی اس کا مثبت رسپانس آنے لگتا ہے۔ اس طرح محبت کا یہ عمل فطری طور پر دونوں انسانوں کے درمیان جاری ہوجاتا ہے۔ ایک شخص کے دل میں دوسرے کے لیے وہی جذبات پیدا ہوجاتے ہیں، جو دوسرے کے اندر پہلے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔

یہ ایک ایسا تجربہ ہے، جس کو ہر انسان اپنی زندگی میں کرسکتا ہے۔ جب بھی ایک شخص کے دل میں دوسرے شخص کے لیے اس طرح کے سچے جذبات پیدا ہوجائیں، تو یہ جذبہ ایک جگہ نہیں ٹھہرے گا، بلکہ وہ سفر کرے گا۔ مجھے اپنی زندگی میں ایسے بعض واقعات معلوم ہیں، جو مجھ کو ذاتی طور پر اس حقیقت کو یقین کے درجے تک پہنچاتے ہیں۔

علم اور تقویٰ

سورہ البقرہ میں فرمایا گیا ہے کہ: وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ (2:282)، یعنی اللہ سے ڈرو اور اللہ تم کو تعلیم دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کا تقویٰ سے بہت گہرا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اور صحت فکر دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ آدمی کے پاس اگر علم یا معلومات کا ذخیرہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ درست فکر یا صحیح سوچ کا بھی حامل ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ علوم قطعیہ (exact sciences) میں ریاضیات اور تجربات کے ذریعہ ایک یقینی بات سامنے آسکتی ہے۔ مگر جہاں تک علوم ظنی (speculative sciences) کا تعلق ہے، ان میں اس قسم کی قطعیت (certainty) ممکن نہیں۔ اس دوسری قسم کے علوم میں صحت فکر کے لیے آنسٹی (honesty) لازمی طور پر ضروری ہوتی ہے۔ تقویٰ آدمی کے اندر یہی آنسٹی پیدا کرتا ہے۔ یہ آنسٹی اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ آدمی کا علم اس کو نادرست طرزِ فکر سے بچالے۔

خالق نے انسان کو لامحدود فکری صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن تفکیری عمل کو درست طور پر جاری کرنے کے لیے ایک فکری گائڈ (intellectual guide) درکار ہے۔ قرآن اسی قسم کا ایک فکری گائڈ ہے، جو اس بات کا ضامن ہے کہ انسان کا تفکیری عمل بھٹکے بغیر درست سمت میں جاری رہے۔ اسلام کی دریافت کے بعد انسان کی زندگی میں ایک نیا تفکیری عمل (intellectual process) شروع ہوجاتا ہے۔ اس کے اندر ایک ارتقا یافتہ ذہن (developed mind) تیار ہوتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہوجاتا ہے کہ چیزوں کو درست زاویۂ نظر سے دیکھ سکے۔

تقویٰ (خوفِ خدا) کبر وغرور کا قاتل ہے۔ تقویٰ آدمی کے اندر انانیت (egoism) کا خاتمہ کردیتا ہے۔ تقویٰ آدمی کو کبر اور خود پسندی سے بچالیتا ہے۔ تقویٰ آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ بے لاگ طور پر سوچے اور غیر جانبدارانہ انداز میں اپنی رائے قائم کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کو علم صحیح کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

جنت کا مسافر

خدا کا مطالبہ یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام اثاثہ کو خدا کے حوالے کر دے۔ اس کے معاوضہ میں خدا نے آخرت میں اپنی جنت کا وعدہ کیا ہے (التوبہ، 9:111)۔

آدمی اکثر اپنے آپ کو بچا کر رکھتا ہے اور اس کے جواب میں دشواریوں کی ایک فہرست پیش کر دیتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی دشواریاں وہ قیمتی مواقع ہیں جن کو عذر نہ بنا کر وہ اپنے رب کو خوش کر سکتا ہے۔ آدمی جن مسائل کی بنا پر اللہ کی طرف بڑھنے سے رکتا ہے، وہی دراصل اس کے لیے ابدی جنت میں ترقی کے زینے ہوتے ہیں۔ وہ دشواریاں اس لیے نہیں ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر رک جائے، وہ اس لیے ہیں تاکہ آدمی ان کی پرواہ کیے بغیر جنت کے لیے آگے بڑھے۔ وہ ان کو خدا تک پہنچنے کا زینہ بنائے۔

خدا کے نزدیک اس کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی تمناؤں کو خدا کے لیے دفن کر دے۔ جو اپنے آرام کو اس کی خاطر چھوڑ دے۔ جو اپنی مشکلات کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھ جائے۔ کسی انسان کے لیے حقیقی کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ اس دنیا میں کچھ حاصل کر لے، کامیاب دراصل وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ پیش کر دے۔

سب سے زیادہ صحت مند وہ ہے جس کی صحت خدا کی راہ میں برباد ہوگئی ہو۔ سب سے زیادہ صاحب مال وہ ہے جو خدا کی خاطر بے مال ہو جائے۔ سب سے زیادہ بلند مرتبہ وہ ہے جو خدا کے لیے بے مرتبہ ہو گیا ہو۔ سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جو اس دنیا کے اندر اپنے رب کی خاطر بالکل لٹا ہوا ہو، پھر وہ اس کے پاس پہنچے۔ کیوں کہ اس کا رب اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر انڈیل دے گا۔ اس حقیقت کو صحابی رسول ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ دنیا سے زہد (بے رغبتی) یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اس سے زیادہ بھروسہ تم کو اس پر ہو جو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب تم پر کوئی مصیبت آئے تو ثواب کی بنا پر اس کا باقی رہنا تمہارے لیے زیادہ پسندیدہ بن جائے (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4100)۔

سفرِ معرفت

انسان کے ذہن میں پیدائش کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر سب سے پہلے جو خیال آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان کا خالق کون ہے۔ اسی تصور کو لے کر تقریباً پانچ ہزار سال پہلے فلسفیانہ غور وفکر کا آغاز ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے دماغ اس غور وفکر میں مشغول ہوئے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ فلسفیانہ غور وفکر کسی فلسفی کو اپنے سوال کے جواب تک نہ پہنچا سکا۔ برطانی فلسفی برٹرینڈ رسل (1872–1970ء) ایک مشہور فلسفی تھا۔ وہ اپنی ساری عمر اس موضوع کے مطالعے میں مشغول رہا۔ مگر ساری عمر کے مطالعے کے باوجود اس کو اپنے سوال کا جواب نہیں ملا۔ اس کے ایک کمنٹیٹر نے اس کے بارے میں درست طور پر لکھا ہے:

“Bertrand Russell was a philosopher of no philosophy.”

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات تمام فلسفیوں کے بارے میں درست ہے۔ ہر فلسفی عملاً فلاسفر آف نو فلاسفی تھا۔ ہر فلسفی کا موضوع یہ تھا کہ وہ سچائی کیا ہے، اس سوال کا جواب فلسفیانہ فریم ورک میں معلوم کرے۔ مگر کوئی بھی فلسفی اپنی اس تلاش میں کامیاب نہیں ہوا۔ سچائی کا فلسفیانہ جواب ہزاروں سال کے تلاش کے باوجود نامعلوم رہا۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انسان نے سوال کو تو جانا۔ لیکن وہ اس سے بے خبر رہا کہ اس سوال کا جواب پانے کے لیے صحیح طریقِ مطالعہ (methodology) کیا ہے۔ حالاں کہ جتنی اہمیت کسی سوال کی ہے۔ اتنی ہی اہمیت اس سوال کا جواب پانے کے لیے صحیح طریقِ مطالعہ (methodology) کی ہے۔

راقم الحروف کو اس سوال کا جواب قرآن میں ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام کے ذریعے اللہ رب العالمین نے اس میتھڈالوجی کو اشارہ کی زبان میں بتا دیا تھا۔ لیکن کوئی عالم یا فلسفی اس کو متعین طور پر جان نہ سکا۔ قرآن کا جواب سورہ الاعراف میں اس طرح ملتا ہے۔ پیغمبر موسیٰ مصر سے نکلنے کے بعد جب صحرائے سینا میں پہنچے تو وہاں ماؤنٹ سینائی (Mount Sinai)

کے مقام پر ان پر ایک تجربہ گزرا۔ پیغمبر موسیٰ کے اوپر یہ تجربہ ایک اندازے کے مطابق پندرھویں صدی قبل مسیح کے نصف ثانی میں گزرا۔ اس واقعے کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِي وَلَكِنِ انْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَى صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ (7:143)۔ یعنی اور جب موسیٰ ہمارے وقت پر آ گیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا، مجھے اپنے کو دکھا دے کہ میں تجھ کو دیکھوں۔ فرمایا، تم مجھ کو ہر گز نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو تم بھی مجھ کو دیکھ سکو گے۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا، اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب ہوش آیا تو بولا، تو پاک ہے، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔

پیغمبر موسیٰ کے اس تجربے میں ایک علمی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ انسان موجودہ دنیا میں خدا کو براہ راست طور پر نہیں دیکھ سکتا۔ اللہ رب العالمین کو دیکھنے کی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ انسان مخلوقات میں غور وفکر کرکے استنباط (inference) کے ذریعہ اس کے خالق کی دریافت کرے۔ یہی وہ نکتہ ہے، جس کی وجہ سے علم حقیقت کا سفر اپنی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ خالق اور مخلوق دونوں ایک نہیں ہیں، بلکہ دونوں مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں صحیح میتھڈالوجی صرف یہ ہے کہ انسان پہلے یہ دریافت کرے کہ خالق اور مخلوق دونوں الگ الگ ہیں، اور پھر مخلوق یعنی کائناتی نشانیوں میں غور وفکر کرکے بذریعہ استنباط خالق کو دریافت کرے۔ مگر یہاں یہ واقعہ انسان کے لیے ایک رکاوٹ بنا رہا کہ اس کو یہ طریقہ معلوم نہ تھا کہ وہ خالق کو الگ کرکے مخلوق کو کس طرح دریافت کرے۔

یہ ڈی لنکنگ (delinking) کا معاملہ تھا۔ یعنی ضرورت تھی کہ انسان خالق کا مطالعہ اور مخلوق کے مطالعہ کو ایک دوسرے سے ڈی لنک کرے۔ مگر انسان کو قدیم زمانے میں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ڈی لنکنگ کی پالیسی کو عملاً کس طرح اختیار کرے۔ یہ واقعہ اٹلی کے سائنس داں گلیلیو گلیلی

(وفات 1642ء) نے انجام دیا۔ جرمن سائنس داں البرٹ آئنسٹین (1955-1879ء) نے درست طور پر لکھا ہے کہ گلیلیو جدید سائنس کا بانی تھا:

“Galileo was the father of modern science.”

آئنسٹین کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ گلیلیو سے پہلے سائنس بیک وقت دو قسم کے خیالات میں الجھی ہوئی تھی۔ یعنی حقیقت کا قابل مشاہدہ پہلو (observable aspect) اور نا قابل مشاہدہ پہلو (non-observable aspect)۔ دوسرے لفظوں میں کیفیاتی (qualitative) پہلو اور کمیاتی (quantitative) پہلو۔ گلیلیو نے دونوں کو ایک دوسرے سے ڈی لنک کر دیا۔ نا قابل مشاہدہ پہلو کو فلسفیانہ تلاش کے خانے میں رکھا، اور قابل مشاہدہ پہلو کو سائنس کی تلاش کے دائرے میں ڈال دیا۔ اس سے پہلے سائنس کا سفر گویا کہ ایک بند دروازے میں رکا ہوا تھا، گلیلیو نے اس بند دروازے کو کھول دیا۔

گلیلیو اس دریافت تک کس طرح پہنچا۔ اس کا بھی ایک سبب تھا۔ گلیلیو کے زمانے میں دوربین (telescope) ابتدائی طور پر دریافت ہوئی۔ گلیلیو نے پہلی بار 1610ء میں اس کے ذریعے سیاروں کی گردش کا براہ راست مطالعہ کیا۔ اس طرح شمسی نظام (solar system) کا براہ راست مطالعہ کا آغاز ہوا۔ اسی کے ساتھ سائنس کا ایک نیا دور شروع ہو گیا، جس میں پوری فیزیکل ورلڈ ایک قابل مطالعہ چیز بن گئی۔

اس اعتبار سے گلیلیو نہ صرف فادر آف ماڈرن سائنس ہے، بلکہ وہ بالواسطہ طور پر فادر آف ماڈرن علم کلام بھی ہے۔ کیوں کہ گلیلیو سے پہلے علم کلام صرف ٹکنکل بحثوں میں الجھا ہوا تھا، وہ کسی حقیقت کو دریافت نہیں کر پایا تھا۔ لیکن گلیلیو کے بعد یہ ممکن ہو گیا کہ علم کلام کو ایک نئے دور میں پہنچایا جا سکے، یعنی وہ دور جس کو قرآن میں تبیین حق کا دور بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی متعلقہ آیت (41:53) کا ترجمہ یہ ہے: عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔ (علم کلام کی تفصیل کے لیے دیکھیے، ماہنامہ الرسالہ، اپریل 1978، بعنوان: علم کلام کی حقیقت)۔

جدید سائنسی دور سے پہلے انسان کائناتی نشانیوں کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ چنانچہ قدیم

زمانے میں معرفت اعلیٰ تک پہنچنے کے لیے فریم ورک ہی موجود نہ تھا۔ موجودہ زمانے میں سائنسی انقلاب کے بعد انسان کو اعلیٰ فریم ورک حاصل ہوا۔ اسی انقلاب کا یہ نتیجہ ہے کہ بیسویں صدی میں علم الٰہیات میں بہت سے نہایت قابل قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نمائندہ کتاب وہ ہے، جس کا عربی ترجمہ اس معنی خیز عنوان کے ساتھ چھپا ہے— اللّٰہ یتجلی فی عصر العلم (مترجم الدکتور الدمرداش عبدالمجید سرحان)۔ اصل کتاب کا انگریزی ٹائٹل حسبِ ذیل ہے:

"The Evidence of God in an Expanding Universe."

اس اعتبار سے غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ علم الٰہیات یا علم کلام کے معاملے میں گلیلیو گلیلی کا کارنامہ ایک تائیدی کارنامہ ہے۔ غالباً اسی تائید کا ذکر حدیث میں ان الفاظ میں آیا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَيُؤَيِّدُ هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الفَاجِرِ (مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر 1096)۔ یعنی اللہ تعالیٰ ضرور اس دین کی تائید فاجر انسان کے ذریعہ کرے گا۔

میرا قیاس ہے کہ یہاں "الرجل الفاجر" سے مراد سیکولر انسان ہے، اور یہ سیکولر انسان غالباً گلیلیو گلیلی تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ گلیلیو گلیلی کی اس دریافت کے بعد بیک وقت علم کے دو دروازے کھلے۔ ایک دروازہ تھا فیزیکل سائنس کا ڈیولپمنٹ، اور دوسرا دروازہ تھا علم الٰہیات کا دروازہ، جو اس سے پہلے کلامی موشگافیوں میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کو ایک تسلیم شدہ علمی بنیاد حاصل ہوئی۔ اس کے بعد یہ ممکن ہوگیا کہ اس علمی بنیاد کو استعمال کرکے علم الٰہیات کو دورِ جدید میں نئی طاقت کے ساتھ مرتب کیا جاسکے۔

توحید کا آغاز معرفت (realisation) سے ہوتا ہے۔ یعنی کائناتی نشانیوں میں تدبر وتفکر کرکے خدا کو خالق ومالک کی حیثیت سے دریافت کرنا۔ قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نشانیاں (signs) اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کوئی گنتی نہیں ہوسکتی۔ یہی وہ لامحدود کائناتی نشانیاں ہیں جن پر تدبر کرکے انسان اپنے رب کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ یہ تدبر پہلے روایتی فریم ورک میں کیا جاتا تھا۔ گلیلیو کے بعد تدبر کا یہ عمل سائنسی فریم ورک میں کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ اس طرح آج ایک انسان کے لیے یہ بات اعلیٰ پیمانے پر ممکن ہوچکی ہے کہ وہ اللہ کی بے پایاں عظمت کو دریافت کرکے اس کے آگے جھک جائے۔

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

(حدیث نمبر 109-96)

96

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور اس وقت آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔ آپ نے کہا کہ کیا تم جانتے ہو یہ دو کتابیں کیا ہیں۔ ہم نے کہا کہ نہیں اے خدا کے رسول، اِلّا یہ کہ آپ ہمیں بتائیں۔ پھر آپ نے داہنے ہاتھ والی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ ایک کتاب ہے جو رب العالمین کی طرف سے ہے۔ اس میں اہلِ جنت کے نام ہیں، ان کے باپوں کے نام اور ان کے قبیلوں کے نام ہیں۔ پھر ان کی کل تعداد آخر میں درج کردی ہے، اب ان میں نہ کبھی زیادتی ہوگی اور نہ کمی۔ پھر آپ نے بائیں ہاتھ والی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ ایک کتاب ہے جو رب العالمین کی طرف سے ہے۔ اس میں اہلِ دوزخ کے نام ہیں، اس میں باپوں کے نام اور ان کے قبیلوں کے نام ہیں۔ پھر ان کی کل تعداد آخر میں درج کردی ہے۔ اب ان میں نہ کبھی زیادتی ہوگی اور نہ کمی۔ پھر آپ کے اصحاب نے کہا کہ اے خدا کے رسول۔ پھر کس چیز میں عمل، اگر سب کچھ ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اعتدال کے ساتھ سیدھی راہ پر چلنے کی کوشش کرتے رہو (سَدِّدُوا وَقَارِبُوا)۔ کیوں کہ جو شخص جنت کا اہل ہے اس کا خاتمہ جنت والوں جیسے عمل پر ہی ہوگا اگرچہ وہ کوئی بھی عمل کرے۔ اور جو شخص دوزخ کا اہل ہے۔ اس کا خاتمہ دوزخ والوں جیسے عمل پر ہی ہوگا اگرچہ وہ کوئی بھی عمل کرے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا اور دونوں کو ایک طرف ڈال دیا۔ پھر آپ نے فرمایا: تمہارا رب اپنے بندوں سے فارغ ہو چکا، ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ دوزخ میں (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2141)۔

حدیث کے یہ الفاظ (سَدِّدُوا وَقَارِبُوا) بتاتے ہیں کہ حدیث کا مطلب کیا ہے — اعتدال کے ساتھ سیدھی راہ پر چلنے کی کوشش کرتے رہو۔ یہی صابرانہ روش ہے۔ یہ کسی آدمی کے سنجیدہ مزاج

ہونے کی ایک علامت ہے۔ اس کا تعلق کسی ایک معاملے سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات سے اس کا تعلق ہے۔ جو آدمی اپنے قول وفعل میں اعتدال پر قائم رہے، وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ جذباتیت سے پاک ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو سوچ کر بولتا ہے اور جب کرتا ہے تو وہ سوچ سمجھ کر کرتا ہے، وہ سطحیت پسندی (superficiality) سے پاک ہے۔ اس کا کردار اس کی عقل کے تابع ہوتا ہے، نہ کہ اس کے جذبات کے تابع۔ ایسا ہی انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو یہ نصیحت کی تھی کہ خود کو راہ راست پر رکھو، بے اعتدالی سے بچو، صبح وشام کی عبادت کرو، اور رات کے کچھ حصے میں۔ میانہ روی اختیار کرو، میانہ روی (moderation) تم منزل تک پہنچ جاؤ گے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6463)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں موجود مذکورہ کتاب میں درج ناموں سے مراد غالباً ذاتی نام نہیں ہیں بلکہ صفاتی نام ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اور جہنم کا فیصلہ جن صفات (اصول) پر کیا جانا مقدر ہے انھیں صفات پر اس کا فیصلہ ہوگا۔ کسی اور صفت یا کسی اور نسبت کی بنیاد پر کسی کے لیے جنت یا جہنم کا فیصلہ ہونے والا نہیں۔ اب اس معاملہ میں اللہ کا فیصلہ بدلنے والا نہیں۔ چنانچہ جو انسان پوری سنجیدگی اور اعتدال کے ساتھ ان صفات کو اپنانے کی کوشش کرے گا، اس کے بارے میں امید ہے کہ وہ ضرور اللہ کی نصرت اور رحمت سے جنت کا مستحق قرار پائے گا۔

97

ابوخزامہ تابعی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسول، وہ جھاڑ پھونک جو ہم کراتے ہیں اور دوا جس کے ذریعہ ہم علاج کرتے ہیں اور حفاظتی اسباب جس سے ہم اپنا بچاؤ کرتے ہیں، کیا یہ اللہ کی تقدیر کو کچھ بدل دیتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ خود اللہ کی تقدیر سے ہیں (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2065، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3437)۔

حدیث کے آخری الفاظ (هِيَ مِنْ قَدَرِ اللَّه) سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کی حدیثوں کا مطلب اسبابِ دنیا کو اختیار کرنے سے روکنا نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے مطابق، خود اسباب میں

تاثیر (effect) بھی خدا کی مقدر کی ہوئی ہے، وہ ان اشیا کی ذاتی صفت نہیں۔

98

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف آئے اور ہم تقدیر کے مسئلہ پر بحث کررہے تھے۔ آپ غضبناک ہوگئے، یہاں تک کہ آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ گویا کہ آپ کے رخساروں پر انار کے دانے نچوڑ دیے گئے ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا: کیا تم لوگوں کو اسی کا حکم دیا گیا ہے، کیا میں اسی کے ساتھ تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں۔ تم سے پہلے کے لوگ تباہ کردیے گئے جب کہ انھوں نے اس معاملے میں بحث کی۔ میں نے تمہارے اوپر لازم کیا کہ تم اس معاملے میں بحث نہ کرو (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2133)۔

تقدیر کا مسئلہ ایک بے حد نازک مسئلہ ہے۔ الٰہیات کے میدان میں قدیم زمانے سے یہ بحث جاری ہے کہ اِس دنیا میں انسان آزاد ہے، یا مجبور۔ بظاہر انسان اِس دنیا میں اپنے آپ کو آزاد پاتا ہے، لیکن جب خدا قادرِ مطلق ہے تو یہ بات ناقابلِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ خدا کی قدرتِ کاملہ کے درمیان انسان کو خود مختاری حاصل ہو۔ اِس تصور پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ اردو شاعر میر تقی میر (وفات 1810ء) نے اِسی بات کو اِس طرح نظم کیا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی　　چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

مگر یہ اعتراض ایک غیر معقول اعتراض ہے۔ کیوں کہ خدا کو اگر ہر قسم کا اختیار حاصل ہے تو اُس کو یقیناً یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی مقام پر اپنی قدرت کو محدود کرلے۔ اصل یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت کے اعتبار سے اللہ رب العالمین کے آگے مکمل طور پر مجبور مخلوق ہے۔ مگر اللہ تعالی نے اپنے منصوبۂ تخلیق کے تحت اپنی قدرت کو وقتی طور پر محدود کرلیا ہے، اور اس صفتِ اختیار (قدرت) کا ایک شمہ (iota) انسان کو محدود مدت کے لیے بطور عطیہ دے دیا ہے۔ موت گویا اس صفتِ اختیار کے خاتمہ کا اعلان ہے۔

یہ عطیہ ٹسٹ (test) کے لیے ہے۔ یعنی انسان اگر اپنے اختیار کا غلط استعمال (misuse) کرے تو اس کی پکڑ ہوگی، لیکن اگر وہ اختیار کا درست استعمال کرے تو اس کو انعام ملے گا۔ اسی کے

ساتھ انسان کو قلیل علم دیا گیا ہے (الاسراء، 17:85)۔ اپنی اس محدودیت کی بنا پر انسانوں کے لیے تقدیر کی تفصیلی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں اجمالی علم پر قناعت کرے۔ اس معاملہ میں کلی علم کا حصول اس کے لیے ممکن نہیں۔

یہ قیاس بظاہر ایک نظری قیاس ہے۔ بلیک ہول کی دریافت نے اِس قیاس کے لیے مظاہراتی سطح پر ایک عملی تصدیق فراہم کردی۔ بلیک ہول کا نظریہ تقدیر کے معاملے میں انسانی علم کی محدودیت کو قابلِ فہم بنا رہا ہے۔ ایمسٹرڈم (نیدرلینڈس) میں ماہرینِ طبیعیات (physicists) کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اِس موقع پر فزکس کا نوبل پرائز (1980ء) پانے والے ایک سائنس داں مسٹر جیمس واٹسن (James Watson Cronin, 1931-2016) نے اپنے مقالے میں بتایا کہ ہماری کائنات کا 96 فی صد حصہ سیاہ مادّہ (dark matter) پر مشتمل ہے۔ اُس کی روشنی یا ریڈی ایشن ہم تک نہیں پہنچتا، اِس لیے ہم اُس کو براہِ راست طور پر دیکھ نہیں پاتے:

''Dark matter can not be detected directly, because it does not emit or reflect light or radiation.''

جیمس واٹسن نے مزید کہا کہ — ہم سمجھتے ہیں کہ ہم کائنات کو جانتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر چیز کے صرف 4 فی صد حصے کو جان سکتے ہیں:

''We think we understand the universe, but we only understand four percent of everything.'' (*The Times of India*, September 23, 2007, p. 20)

بلیک ہول کا نظریہ تقدیر کے مسئلے میں انسانی علم کی محدودیت کو قابلِ فہم بنا رہا ہے۔

99

ابن ماجہ نے بھی اسی طرح کی روایت عمرو بن شعیب سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے اپنے دادا سے نقل کی ہے (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 85)۔

100

ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: اللہ نے آدم کو مٹھی بھر خاک سے پیدا کیا۔ اس کو اللہ نے ساری زمین سے لیا تھا۔ پس آدم کی

اولاد زمین کے اندازے پر ہوئی۔ ان میں سے کچھ سرخ ہیں اور کچھ سفید اور کچھ کالے اور کچھ درمیانی۔ اور کچھ نرم اور کچھ سخت اور کچھ ناپاک اور کچھ پاک (مسند احمد، حدیث نمبر 19642؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 2955؛ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4693)۔

انسانی جسم کے ترکیبی اجزاء عین وہی ہیں جو سیارۂ زمین کے ترکیبی اجزاء ہیں۔ البتہ انسان کے اندر جو روح ہے وہ غیر زمینی یا غیر ماڈی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ماڈی وجود سے اوپر اٹھائے اور اپنے آپ کو ایک غیر مادی وجود کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کرے۔ وہ اپنی روح کو اپنی اصل ہستی سمجھے اور اپنے جسم کو صرف ایک وقتی قیام گاہ کا درجہ دے۔

101

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: ’’اللہ نے اپنی مخلوق کو ایک تاریکی میں پیدا کیا۔ پھر ان کے اوپر اپنے نور کا ایک حصہ ڈال دیا۔ پھر جس نے اس نور میں سے پایا وہ ہدایت یاب ہوا۔ اور جس نے اس کو نہیں پایا وہ گمراہ ہو گیا‘‘۔ اسی بنا پر میں (عبداللہ بن عمرو) یہ کہتا ہوں کہ اللہ کے علم پر قلم سوکھ گیا ہے (مسند احمد، حدیث نمبر 6644؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 2642)۔

اس حدیث میں تمثیلی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے جسمانی وجود کی بقا کے لیے وہ اسباب کافی ہیں جو زمین پر پائے جاتے ہیں۔ مگر انسان کے روحانی وجود کی بقا اور ارتقا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ اس کو خدا کے فیض سے خصوصی ربانی حصہ ملے۔ ’’اللہ کے علم پر قلم سوکھ گیا ہے‘‘۔ یعنی اللہ کے علم کی بنیاد پر قلم کو جو کائناتی منصوبہ لکھنا تھا، وہ اس نے اللہ کے حکم سے لکھ دیا ہے، اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے — اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں (10:64)۔

102

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ کہتے تھے: ’’يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ‘‘ (اے دلوں کے پھیرنے والے، میرے دل کو اپنے دین پر

جمادے)۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ پر ایمان لائے اور جو کچھ آپ لے آئے اس پر۔ پھر کیا آپ ہمارے اوپر اندیشہ کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ لوگوں کے دل خدا کی انگلیوں کے درمیان ہیں۔ وہ ان کو الٹتا پلٹتا ہے جیسا کہ وہ چاہتا ہے (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2140؛ سنن ابن ماجہ 3834)۔

موجودہ دنیا میں انسان کو مکمل طور پر ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے مگر اسی کے ساتھ دوسری حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیت کے اعتبار سے آخری حد تک ایک عاجز مخلوق ہے۔ اس عجز کی بنا پر ہر وقت اس کے لیے اندیشہ ہے کہ کوئی بھی چیز اس کو حق سے ہٹا دے۔ یہی عجز کا احساس آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا سے بار بار حق پر ثابت قدمی کی دعا کرتا رہے۔

اس حقیقت کو ایک دوسری حدیثِ رسول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: عَنْ عَائِشَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: سَدِّدُوا، وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا، فَإِنَّهُ لَا يُدْخِلُ أَحَدًا الْجَنَّةَ عَمَلُهُ قَالُوا: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي اللَّهُ بِمَغْفِرَةٍ وَرَحْمَةٍ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6467)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنا رویہ درست رکھو اور میانہ روی پر قائم رہو اور پُر امید رہو، کیوں کہ کسی بھی شخص کو اُس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ لوگوں نے کہا کہ کیا آپ کو بھی نہیں اے خدا کے رسول، آپ نے فرمایا کہ ہاں مجھ کو بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ مجھ کو اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لے۔

ان دونوں حدیثوں کو ملا کر پڑھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی رحمت اور مغفرت کے حصول کے لیے اپنی کوشش کے ساتھ ساتھ اللہ تعالی سے ثابت قدمی کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔

103

ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دل کی مثال ایسے پر (feather) کی ہے جو ایک کھلے میدان میں ہو۔ اس کو ہوائیں اوپر نیچے الٹ پلٹ کر رہی ہوں (مسند احمد، حدیث نمبر 19758)۔

انسان اگر اپنے وجود اور اس اتھاہ کائنات کے درمیان تقابلی غور وفکر کرے تو اس کو یہ معلوم

ہوگا کہ لامحدود طور پر وسیع کائنات میں اس کی حیثیت ایک انتہائی عاجز مخلوق کی ہے۔ اسی طرح فکری اعتبار سے بھی وہ بے حد کمزور ہے۔ یعنی ہر لمحہ وہ شیطان کے حملوں کے نشانہ پر رہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہی انسان شیطان کے فتنوں سے بچ سکتا ہے جس کا شعور پوری طرح زندہ ہو اور اسی کے ساتھ وہ مسلسل خدا سے اس کی مدد مانگتا رہے۔

104

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے۔ وہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں اس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اور وہ ایمان لائے موت پر اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر اور وہ ایمان لائے تقدیر پر (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2145؛ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 81)۔

ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے یہ یقین کرے کہ زندگی کے سوالات کا صحیح جواب صرف وہ ہے جو خدا کے نزدیک ان کا صحیح جواب ہے۔ اور یہ جواب انسان کو خدا کے پیغمبر کے واسطہ سے ملتا ہے، نہ کہ براہِ راست۔ قرآن اس سلسلے میں گائڈ بُک کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن میں خدا کی مطلوب زندگی کے بنیادی اصول بتا دیے گئے ہیں، اور حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

105

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں دو قسم کے لوگ وہ ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں — مرجیہ اور قدریہ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2149)۔

مرجیہ سے مراد جبریہ ہیں، یعنی وہ لوگ ہیں جو بندے کو مجبور محض مانیں، یعنی جو کام بھی انسان کرتا ہے وہ اللہ کی قدرت کے تحت کرتا ہے، اس میں بندے کا کوئی اختیار شامل نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں قدریہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہ مانیں کہ انسان اپنے ہر فعل کا خالق خود ہے، وہ ہر فعل خود اپنی قدرت سے کرتا ہے، اس میں اللہ کی قدرت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ دونوں نظریات انتہا پسندی

پر مبنی ہیں۔ پہلا نظریہ جبر میں انتہا پسندی کی پیداوار ہے اور دوسرا نظریہ اختیار میں انتہا پسندی کا۔ جب کہ اصل حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے۔ اسی انتہا پسندی کا نام غلو ہے، اور غلو آدمی کو خدا کے دین سے ہٹا کر خود ساختہ دین پر کھڑا کر دیتا ہے۔

106

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: میری امت میں بھی خسف (زمین میں دھنسنا) اور مسخ (صورت کا بگڑ جانا) ہوگا۔ اور یہ ان لوگوں پر ہوگا جو تقدیر کو جھٹلائیں (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4613؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 2152)۔

تقدیر کو جھٹلانا اتنا بڑا جرم اس لیے ہے کہ ایسا آدمی گویا خدا کی قدرت اور اس کے علم کا انکار کرتا ہے۔ وہ خدا کو مانتے ہوئے خدا کو اس کا حقیقی درجہ نہیں دیتا۔

107

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قدریہ اس امت کے مجوس ہیں۔ پس اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت کو مت جاؤ، اور اگر مریں تو ان کے جنازہ میں شرکت نہ کرو (مسند احمد، حدیث نمبر 5584؛ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4691)۔

قدریہ وہ لوگ ہیں جو یہ عقیدہ رکھیں کہ بندہ اپنا ہر عمل خود اپنی قدرت سے کرتا ہے، خدا کی قدرت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ ایسے لوگوں کی مشابہت مجوسیوں (Zoroastrians) سے یہ ہے کہ مجوس خدا کے وجود کو دو ذات میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی طرح مذکورہ عقیدہ رکھنے والے لوگ گویا خدا کو اس کی قدرت سے الگ کررہے ہیں۔ گویا کہ وہ دو قادر مان رہے ہیں، ایک خدا اور دوسرے انسان۔

108

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ اہل قدر کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ رکھو اور نہ ان کے ساتھ کلام کرو (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4710)۔

اہلِ قدر سے مراد وہ لوگ ہیں جو تقدیرِ الٰہی کے منکر ہیں، اور تقدیر کے انمسائل میں بہت زیادہ غور وفکر کرتے ہیں، جو علم قلیل (الاسراء، 17:85) کی حد سے باہر ہیں۔ ایسے لوگوں سے ملنے

جلنے اور بات کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ آدمی ذہنی انتشار (confusion) میں مبتلا ہوجائے اس لیے اس سے منع فرمایا۔ تاہم جولوگ علمی صلاحیت رکھتے ہوں وہ اصلاحی مقصد کے تحت ایسے لوگوں سے ملیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

109

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھ آدمی ایسے ہیں جن پر میں لعنت کرتا ہوں اور اللہ نے بھی ان پر لعنت کی ہے، اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اللہ کی کتاب میں (اپنی طرف سے) اضافہ کرنے والا، اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا، طاقت کے زور پر غلبہ حاصل کرنے والا تا کہ وہ اس شخص کو عزت دے جس کو اللہ نے (اس کی سرکشی کی وجہ سے) ذلیل کیا ہے اور وہ اس شخص کو ذلیل کرے جس کو اللہ نے عزت دی ہے۔ اور اللہ کے حرام کو حلال کرنے والا، اور میری آل کے متعلق وہ باتیں حلال سمجھنے والا جنھیں اللہ نے حرام کیا۔ اور میری سنت سے منہ موڑنے والا (المدخل الی علم السنن للبیہقی، حدیث نمبر 146؛ السنۃ لابن ابی عاصم، حدیث نمبر 337)۔

اس حدیث میں جن کاموں کا ذکر ہے وہ سب سرکشی کی نوعیت کے جرم ہیں اور سرکشی بلاشبہ خدا اور رسول کے نزدیک سب سے زیادہ سنگین جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ عام قسم کا جرم کسی نہ کسی بشری کمزوری کے زیر اثر ہوتا ہے۔ مگر سرکشی انانیت کے جذبہ کے تحت کیا جانے والا ایک فعل ہے، اور انانیت یا تکبر بلاشبہ خدا کی اس دنیا میں کسی انسان کا سب سے بڑا جرم ہے۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کو خدا نے ٹسٹ (امتحان) کے لیے بنایا ہے۔ اسی ٹسٹ کی مصلحت کی بنا پر خدا نے انسان کو پوری آزادی عطا فرمائی ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بغیر ٹسٹ ممکن نہیں۔ یہ ٹسٹ کس بات کا ہے۔ یہ ٹسٹ اِس بات کا ہے کہ انسان حقیقت پسندی کا رویّہ اختیار کرے، وہ آزادی کے باوجود اپنے آپ کو بے آزاد کرلے۔ وہ آزادی کے باوجود اپنے آپ کو خدا کے کنٹرول میں دے دے۔ وہ اختیار رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بے اختیار کرلے۔ یعنی آزادی کے باوجود اپنے اختیار سے خدا کے آگے جھک جانا۔ خدا کا اصل مطلوب دین یہی آزادانہ سرینڈر ہے۔ جو شخص اس طرح آزاد ہوتے ہوئے خدا کے آگے سرینڈر کرے وہ موت کے بعد کی ابدی زندگی میں جنت کا انعام پائے گا اور جو شخص ایسا نہ کرے وہ موت کے بعد کی زندگی میں جہنم میں داخل ہوگا۔

انتہا پسندی

انتہا پسندی (extremism) ایک فطری صفت ہے۔ یہ صفت کسی شخص کے اندر کم ہوتی ہے اور کسی شخص کے اندر زیادہ۔ اس صفت کا تعمیری استعمال دنیا میں بھلائی پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس جب اس صفت کا غلط استعمال ہونے لگے تو دنیا برائی سے بھر جاتی ہے۔ یعنی انتہا پسندانہ مزاج کا ایک تعمیری پہلو ہے اور دوسرا اس کا تخریبی پہلو۔ اس کا تعمیری پہلو یہ ہے کہ آدمی اصول کے معاملہ میں سخت حسّاس ہو، وہ دوسروں کے حقوق کے معاملہ میں کمی کو گوارا نہ کرے، وہ حق سے انحراف کو دیکھے تو تڑپ اٹھے۔ وہ اپنی غلطی کو شدید طور پر محسوس کرتا ہو۔ وہ اپنی کوتاہی کے معاملہ میں اس سے زیادہ شدید ہو جتنا کہ کوئی شخص دوسروں کی کوتاہی کے معاملہ میں شدید ہوتا ہے۔ یہ انتہا پسندی صحت مند انتہا پسندی ہے۔ اس قسم کی انتہا پسندی کا مثبت نام حساسیت ہے۔

انتہا پسندی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ منفی رخ اختیار کرے۔ وہ اپنے اس جذبہ کی بنا پر دوسروں سے نفرت کرے۔ وہ دوسروں سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ اصلاح کے نام پر جنگ اور قتل شروع کر دے۔ یہ انتہا پسندی کی قابلِ اعتراض صورت ہے۔ جب انتہا پسندی اس قسم کی منفی صورت اختیار کر لے تو وہ عملاً ایک برائی (evil) بن جاتی ہے، نہ کہ کوئی خیر (good)۔ اس قسم کی انتہا پسندی کے لیے قرآن اور حدیث میں غلو کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

حساسیت (sensitivity) انسان کی خاص صفت ہے۔ حساسیت، خدا کی ایک عظیم نعمت ہے۔ اگر حساسیت نہ ہو تو آدمی حیوان کے مانند ہو جائے گا۔ بُرائی کو برائی سمجھنے کا مزاج اس کے اندر سے ختم ہو جائے گا۔

انتہا پسندی کا مزاج ہمیشہ محاسبہ کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ محاسبہ اپنے خلاف ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس، اپنی کوتاہیوں سے غافل رہنا اور دوسروں کی کوتاہی پر ان سے لڑائی شروع کر دینا سخت گناہ ہے۔ پہلا کردار اگر ثواب کا مستحق بناتا ہے تو دوسرا کردار آدمی کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کی سخت پکڑ کی جائے۔

اجتہاد کیا ہے

اجتہاد زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ اس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد کے لفظ کو شرعی اجتہاد کے معنی میں لینا، اس کو محدود بنانا ہے۔ اجتہاد عملی اعتبار سے اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو فقہاء کے یہاں مروج ہے۔ اجتہاد علمی اعتبار سے تخلیقی طرز فکر (creative thinking) کا دوسرا نام ہے۔

اجتہاد کے لفظ کو محدود شرعی معنی میں لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجتہاد ایک مقدس چیز بن گیا، اور لوگوں کے لیے جائز نہ رہا کہ وہ آزادانہ طور پر اجتہادی طرز فکر کو اختیار کریں۔ حالاں کہ علمی اعتبار سے یہ درست نہ تھا۔ اجتہاد کی یہ شرط بھی نہیں ہے کہ کسی کے پاس افتاء کی ڈگری موجود ہو۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: اسْتَفْتِ قَلْبَكَ، وَاسْتَفْتِ نَفْسَك (مسند احمد، حدیث نمبر 18006)۔ یعنی اپنے دل سے فتویٰ پوچھو، اپنے ضمیر سے فتویٰ پوچھو۔ یہاں دل اور ضمیر کامن سنس کے معنی میں ہے، کسی پراسرار معنی میں نہیں۔ یہ اجتہادی طرز فکر کی بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد دراصل تطبیقِ نو (reapplication) کا نام ہے۔ اجتہاد چھوٹے معاملے میں بھی ہوتا ہے، اور بڑے معاملے میں بھی۔ اجتہاد انفرادی معاملے میں بھی ہوتا ہے، اور قومی معاملے میں بھی۔ اجتہاد مذہبی معاملے میں بھی ہوتا ہے، اور سیکولر معاملے میں بھی۔ اجتہاد کی شرط صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ آدمی کی نیت درست ہو، یعنی وہ دینِ خداوندی پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

اجتہاد کے لفظی معنی ہیں بہت زیادہ کوشش کرنا۔ عملاً اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شرعی حکم جو بظاہر اپنی ابتدائی صورت میں قابل عمل نہ رہے، اس کو دوبارہ قابلِ عمل بنانے کی کوشش کرنا۔ چنانچہ اجتہاد کی ایک تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: بَذْلُ الْوُسْعِ لِنَيلِ حُكْمٍ شَرْعِيٍّ بِطَرِيقِ الِاسْتِنْبَاطِ (ادب المفتی والمستفتی لابن الصلاح، صفحہ 25)۔ یعنی کسی مسئلہ کے حل کے لیے شرعی حکم کو بذریعہ استنباط (inference) معلوم کرنے کی علمی اور فکری کوشش کرنا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں شرعی حکم کی تطبیق نو (reapplication) تلاش کرنا۔

مثلاً مسلمان موجودہ زمانے میں خلافت یا اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کررہے ہیں، مگر ان کا یہ مقصد قربانیوں کے باوجود پورا نہ ہوسکا۔ اب اجتہاد یہ ہے کہ مسلمان یہ دریافت کریں کہ قدیم طرز کی خلافت کا قیام اب سرے سے ممکن ہی نہیں رہا۔ اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ خلافت کے ماڈل کو چھوڑ کر دوسرے قابل عمل ماڈل کو دریافت کرنا، اوراس کے مطابق ملت کی عمارت تعمیر کرنا۔

اسی طرح قرآن میں ایک تاریخی حقیقت کا بیان ان الفاظ میں آیا ہے: یَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَى أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ (5:21)۔ اے میری قوم، اس پاک زمین میں داخل ہوجاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔ اوراپنی پیٹھ کی طرف نہ لوٹو ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔

کچھ لوگ اس آیت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے ساتھ خاص مانتے ہیں۔ یہ بلا شبہ ایک جذباتی اجتہاد ہے۔ کیوں کہ آیت کے الفاظ عام ہیں تو خاص کرنے کی دلیل اس سے نہیں نکلتی۔ قرآن کی اس آیت کے بارے میں موجودہ دور کے علما صحیح اجتہادی اسپرٹ سے تقریباً محروم ہوگئے ہیں۔ ان میں سے کچھ علما اس حد تک گئے ہیں کہ انھوں نے فلسطین کے معاملے میں خودکش حملے کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ صرف انتہا پسندی نہیں ہے، بلکہ وہ حرام کو حلال قرار دینے کے ہم معنی ہے، اور یہ غلطی اس لیے ہوئی کہ علماء نے اسرائیل کے مسئلے کو ایک مستثنیٰ مسئلہ قرار دے دیا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دور کے علماء صحیح اجتہادی اسپرٹ سے تقریباً محروم ہوگئے ہیں۔ وہ اجتہاد کو ایک قسم کی فکری بے راہ روی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ حدیث میں اجتہاد کی اس قدر حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ اگر آدمی سے اجتہاد کرنے میں غلطی ہوجائے، تو اس پر بھی ثواب کی خوش خبری دی گئی ہے (مسند احمد، حدیث نمبر 17774؛ صحیح البخاری، حدیث نمبر 7352)۔ چنانچہ اس ڈر سے اجتہاد نہ کرنا کہ کہیں مجھ سے غلطی نہ ہوجائے، یہ ایک بے بنیاد وسوسہ ہے، نہ کہ صحیح اسلامی اسپرٹ۔ حقیقت یہ ہے کہ ملت کے مستقبل کی تعمیر ممکن کی بنیاد پر ہوسکتی ہے، ناممکن کی بنیاد پر نہیں۔ اور زمانی اعتبار سے ناممکن اور ممکن کے درمیان کا فرق صرف اجتہاد کے ذریعے معلوم ہوسکتا ہے۔ کسی ڈکشنری کو کنسلٹ کرنے سے اس کا جواب ملنے والا نہیں۔

سمتِ سفر

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان یہ تھا: إستيقظوا من النوم أيها المسلمون (اے مسلمانو، نیند سے جاگو)۔ اس کو پڑھ کر مجھے عربی شاعر معروف الرصافی (وفات 1945ء) کی نظم یاد آ گئی۔ اس نے طنزیہ انداز میں عربوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس نظم کا ایک شعر یہ تھا— تم سوجاؤ اور بیدار نہ ہو۔ کیوں کہ سونے والے لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں:

نامُوا وَلَا تَستَیقِظُوا لَا فَازَ اِلّا النُّوَّمُ

عربوں سے (یا مسلمانوں سے) یہ شکایت میرے نزدیک خلافِ واقعہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عرب اور دوسرے مسلمان خوب جاگے۔ انہوں نے بڑی بڑی سرگرمیاں دکھائیں۔ البتہ ان سرگرمیوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ نتیجہ کے فقدان کو لوگ عمل کے فقدان پر محمول کر کے ان سے شکایت کر رہے ہیں۔

مثال کے طور پر فلسطین کے مسئلہ کو لیجیے۔ شیخ حسن البنا نے 1948ء میں اس کے لیے بڑے پیمانہ پر جہاد کیا۔ الاخوان المسلمون اپنی تاسیس کے وقت سے لے کر اب تک نہایت بلند بانگ طور پر فلسطین کے مسئلہ پر سرگرم رہے ہیں۔ خود فلسطینی لوگ فلسطین کے اندر اور اس کے باہر پرشور طور پر جاگے ہوئے ہیں، اور اسی طرح ساری دنیا کے مسلمان بھی۔ جمال عبد الناصر نے اسی سوال پر 1967ء میں اسرائیل، فرانس اور برطانیہ سے جنگ کی۔ خلیج کی جنگ 1991ء کی ایک وجہ فلسطین کا مسئلہ ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے مسلمانوں نے صدام حسین کے روپ میں صلاح الدین ایوبی کو دوبارہ پیدا کر لیا۔ مگر ساری کوششوں کے باوجود نتیجہ بالکل الٹا نکل رہا ہے۔ اس مدت میں اسرائیل کا رقبہ کئی گنا بڑھ گیا اور اس کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور فلسطینیوں کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا ہے۔

ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگ سو رہے ہیں، انھیں جگایا جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگ بے فائدہ سمتوں میں دوڑ رہے ہیں، اور ضرورت ہے کہ ان کو غلط سمت سے موڑ کر صحیح سمت میں سرگرم سفر کیا جائے۔ مسئلہ غلط رخ پر عمل کرنا ہے، نہ کہ سرے سے عمل نہ کرنا۔ عمل کی صحیح سمت وہ ہے جو نتیجہ خیز ہو، جو عمل نتیجہ خیز نہ ہو وہ صحیح عمل کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا میں نتیجہ صحیح سمت میں عمل کرنے سے ملتا ہے، نہ کہ مجرد عمل کرنے سے۔

اصل مسئلہ

فلسطینی تحریک انتفاضہ (uprising) کے بارے میں بہت سی کتابیں چھپی ہیں۔ ان میں سے ایک 125 صفحہ کی وہ عربی کتاب ہے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے: اس کتاب کے ایک باب میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلم عورت مدینہ کے ایک یہودی بازار میں تھی۔ ایک یہودی نے اس کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ عورت نے فریاد کی۔ قریب میں موجود ایک مسلمان نے اس کو سنا اور فوراً ہی تلوار لے کر یہودی کی گردن ماردی (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 48)۔

اسی طرح عموریہ میں ایک مسلم عورت کو رومیوں نے گرفتار کرلیا۔ اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا: وَا مُعْتَصِمَاہ (ہائے معتصم)۔ ایک مسلمان نے اس پکار کو سنا اور اس کو بغداد کے خلیفہ معتصم تک پہنچایا۔ خلیفہ معتصم فوراً فوج لے کر روانہ ہوا اور عموریہ پہنچ کر مسلم خاتون کو رہائی دلائی (المنتظم فی التاریخ لابن الجوزی، جلد 11، صفحہ 29)۔ تاریخ اسلامی کے ان دو واقعات کو نقل کرنے کے بعد صاحب کتاب لکھتے ہیں:

> کتنی ہی بار فلسطین میں اور لبنان کے خیمہ گاہوں میں اور مختلف ملکوں میں بیواؤں اور یتیموں اور بوڑھوں اور بچوں کے منھ سے فریاد اور اعانت طلبی کی پکار بلند ہوئی۔ مگر مسلمانوں کی طرف سے انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ امت میں کوئی رہنما اور کوئی لیڈر اور کوئی جماعت اور کوئی حاکم ان کی مدد کے لیے حرکت میں نہیں آیا۔ گویا کہ روئے زمین کے مسلمانوں کے لیے ان کے بھائیوں کا معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

صاحب کتاب کے یہ آخری الفاظ بالکل خلاف واقعہ ہیں۔ حقیقت عین اس کے برعکس ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ فلسطین میں اور دوسرے ملکوں میں مظلوم مسلمانوں (عورتوں اور مردوں) کی پکار پر بے شمار لوگ اٹھے۔ 1948ء میں حسن البنا (وفات 1949ء) مسلمانوں کی بہت بڑی جمعیت کے ساتھ

اٹھے اور لبیک یا فلسطین کا نعرہ لگاتے ہوئے یہودیوں کے خلاف جہاد کیا۔1965ء میں جمال عبد الناصر نے حکومت کی پوری طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔مگر یہ ساری کوششیں غیر موثر ثابت ہوئیں۔ اسی طرح ساری دنیا میں لاکھوں مسلمانوں نے اپنے مظلوم بھائیوں کی حمایت میں جہاد کیا اور اسی راہ میں اپنی جانیں دیدیں۔

مدینہ میں یا عَمور یہ میں مظلوم خواتین کی مدد کے لیے جو قربانی دی گئی وہ مقدار کے اعتبار سے اس سے بہت کم ہے جو موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مظلوم عورتوں اور مردوں کے لیے دی گئی ہے۔مگر نتیجہ بالکل مختلف ہے۔ مدینہ میں اور عَمور یہ میں نسبتاً کم قربانیوں سے جو مقصد حاصل کرلیا گیا تھا، وہ موجودہ زمانہ میں زیادہ قربانی کے باوجود حاصل نہ کیا جاسکا۔

صاحب کتاب اور اس قسم کے دوسرے مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی سوچ کا آغاز ’’مدینہ‘‘ اور ’’عموریہ‘‘ سے کررہے ہیں۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ انہیں اپنی سوچ کا آغاز ’’مکہ‘‘ سے کرنا چاہیے۔’’مدینہ‘‘ اور ’’عموریہ‘‘ تو اسلامی تاریخ میں مرحلۂ تیاری (formative period) کی انتہا تھے، وہ اس کا آغاز نہ تھا۔ مرحلۂ تیاری کا آغاز تو مکہ سے ہوا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے زوال کی بنا پر ان کی تیاری کا معاملہ دوبارہ پیچھے کی طرف لوٹ گیا ہے۔ ان کے اندر اس قسم کے زندہ افراد موجود نہیں ہیں، جس قسم کے زندہ افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کیے تھے۔ فرد کی تیاری کے اعتبار سے آج ہم اپنی تاریخ کے آغاز میں ہیں، ہم اپنی تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ موجودہ مسلم رہنما اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ اس لیے وہ ایسے اقدامات کرتے رہے جس کا نتیجہ ناکامی کے سوا کسی اور صورت میں نکلنے والا نہ تھا۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں پیچھے لوٹ کر مکہ کے ابتدائی دور میں جانا ہوگا۔ اس اعتبار سے جب ہم مکہ کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں ہم کو ’’مدینہ‘‘ اور عموریہ‘‘ سے بالکل مختلف تصویر نظر آتی ہے۔ مثلاً ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عمار بن یاسر، ان کے باپ اور ماں سمیہ بنومخزوم کے حلیف اور مولی تھے اور اسلام قبول کر چکے تھے۔ چنانچہ بنومخزوم کے قبیلہ کے لوگ دوپہر کے وقت جب گرمی خوب تیز ہوجاتی تو ان سب کو لے کر مکہ کے باہر نکلتے اور صحرا کی گرم ریت پر لٹا کر تکلیف دیتے۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرتے اور وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کرتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہتے: صَبْرًا يَا آلَ يَاسِرٍ، فَإِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 5646)۔یعنی، آل یاسر صبر کرو، تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔

عمار بن یاسر کی ماں سمیہ کو خود اسی طرح عذاب دے کر انھوں نے مار ڈالا۔ مگر وہ کسی حال میں اسلام کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئیں (فَأَمَّا أُمُّهُ فَقَتَلُوهَا، وَهِيَ تَأْبَى إِلَّا الْإِسْلَامَ) سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 279۔

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ اور عموریہ کے واقعہ کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا جب تک مکہ کے مذکورہ واقعہ کو اس سے ملا کر نہ دیکھا جائے۔ کیا وجہ ہے کہ مدینہ میں جس قسم کے واقعہ پر اقدام کیا گیا، مکہ میں اسی قسم کے شدید تر واقعہ پر کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مکہ کا زمانہ تیاری اور استحکام کا زمانہ تھا۔ تیاری اور استحکام کے زمانہ میں اقدام غیر موثر ہوتا۔ اس لیے مکہ میں صبر کیا گیا۔ صبر دراصل تیاری اور استحکام کی قیمت ہے۔ جو لوگ ابتدائی مرحلہ میں صبر نہ کریں، وہ بعد کے مرحلہ میں تیاری اور استحکام کے درجہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

''مکہ'' میں ناقابل برداشت صبر کیا جاتا ہے، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ ''مدینہ'' میں ناقابل برداشت کو برداشت کرنے کی حاجت نہ رہے۔ جو لوگ مرحلۂ تیاری میں صبر اور قربانی کا ثبوت نہ دے سکیں، وہ مرحلۂ استحکام کی منزل کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ صدیوں کے عمل کے نتیجہ میں مسلمان دوبارہ اپنی تاریخ کے آغاز میں پہنچ گئے تھے۔ اب ضرورت تھی کہ دوبارہ ان کے درمیان تیاری کا وہی عمل جاری کیا جائے جو مکہ میں جاری کیا گیا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اپنے آپ کو تاریخ کے اختتام والے مرحلہ میں فرض کر کے عملی اقدامات شروع کر دیے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضروری تیاری کے بغیر اقدام پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے لیے بھی مفید نہ ہو سکتا تھا (3:152)، پھر وہ موجودہ مسلمانوں کے لیے کیوں کر مفید ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے جس نے ان کے عملی اقدامات کو بے فائدہ اور غیر موثر بنا دیا۔

ایک سوال

عیدالفطر (2019) کی مناسبت سے خطبہ سننے کا موقعہ ملا۔ خطبہ میں مسلمانوں کے بارے میں یہ کہا گیا کہ ان کے خلاف ہندستان میں یہ نعرے لگائے جارہے ہیں: لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا (14:13)۔ پھر یہی خطیب صاحب دعوت کی بات بھی کررہے تھے، دوسرے مقامات سے بھی فون آیا تھا کہ وہاں کے خطیب حضرات بھی یہی بات اسی آیت سے استدلال کررہے تھے۔ یہاں میرا سوال یہ ہے کہ دورِ تعذیب کی آیتوں کو اس طرح دور جدید پر منطبق (apply) کرنا کہاں تک درست ہے، وضاحت فرمائیں۔ (حافظ سید اقبال احمد عمری، عمرآباد، تامل ناڈو)

یہ قرآن کے نام پر مغالطہ (fallacy) پھیلانا ہے۔ کیوں کہ ان لوگوں کے پاس ایسا ریفرنس نہیں ہے، جو ثابت شدہ طور پر اس بات کی تائید کرتا ہو۔ اس طرح کے معاملے میں برعکس طور پر قرآن یہ پُرامید رہنمائی دیتا ہے: کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (2:249)۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العالمین کے بتائے ہوئے اصول کی بنیاد پر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرنے والی جماعت ضرور غالب آتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی کمزور جماعت ہو۔ اور اس منصوبہ بندی کی بنیادی شرط صبر ہے۔

جو لوگ حالات حاضرہ پر قرآن کی مذکورہ آیت کو چسپاں کرتے ہیں، ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ حضرت عائشہ کے اس قول کا مصداق ہیں: أُولَئِكَ قَرَءُوا، وَلَمْ يَقْرَءُوا (مسند احمد، حدیث نمبر 24609)۔ یعنی انھوں نے قرآن کی آیت کو پڑھا، لیکن انھوں نے قرآن کے مصداق کو نہیں سمجھا۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ قرآن کا از سر نو مطالعہ کریں۔ ان کو چاہیے کہ وہ دوسروں کو برا بتانے کے بجائے، خود اپنی غلطی کا اعلان کریں۔ اس معاملے میں اصل بات جو جاننے کی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر ہند میں یہ غلطی کی کہ اپنے مدعو کو اپنا حریف بنالیا۔ یہ بلاشبہ مسلمانوں کی غلطی تھی۔ اب مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں یوٹرن لیں، اور جن لوگوں کو اپنا حریف بنا رکھا تھا، ان کو اپنا مدعو سمجھ کر مثبت ذہن کے ساتھ اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ اس کے بعد وہ اللہ کی مدد سے بلاشبہ کامیابی حاصل کریں گے۔

سپریم چیز

زندگی میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ انسان کے لیے سپریم چیز کیا ہے۔ میں اپنے تجربے کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ کسی انسان کے لیے سپریم چیز ذہنی اطمینان (peace of mind) ہے۔ کسی انسان کے لیے سپریم چیز نہ تو مال و دولت ہے، نہ شہرت (fame) ہے اور نہ طاقت ہے، اور نہ عوامی مقبولیت (popularity)۔ کسی انسان کے لیے سپریم یافت وہی چیز ہوسکتی ہے جو اس کو فل فل مینٹ (fulfillment) دے۔ اور تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ پیس آف مائنڈ کے سوا کوئی اور چیز انسان کو فل فل مینٹ نہیں دیتی۔

پیس آف مائنڈ کی یہ اہمیت کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پیس آف مائنڈ انسان کی نیچر کے مطابق ہے۔ انسان اپنے نیچر کے مطابق یہ چاہتا ہے کہ وہ آخری حد تک اپنے آپ کو مطمئن بنا سکے۔ مگر کسی انسان کو اطمینان صرف داخلی کامیابی (achievement) پر ہوسکتا ہے خارجی کامیابی پر نہیں۔ اسی داخلی یافت کا دوسرا نام انٹلکچول ڈیولپمنٹ یا اسپریچول ڈیولپمنٹ ہے۔ امریکی دولت مند بل گیٹس (Bill Gates) نے ڈالر کے بارے میں اپنے تجربے کو ان الفاظ میں بیان کیا:

"Once you get beyond million dollars, it is the same hamburger."

بل گیٹس نے جو بات ڈالر کے بارے میں کہی ہے، وہی بات ہر خارجی کامیابی کے لیے درست ہے۔ یہ خارجی کامیابی خواہ دولت ہو، یا بزنس ہو، یا شہرت ہو، یا سوشل میڈیا پر فالوورز کی کثرت ہو، یا پولٹیکل پاور ہو، یا اور کوئی مادی چیز ہو۔ اس قسم کی کوئی بھی چیز انسان کو حقیقی معنی میں ذہنی اطمینان عطا نہیں کرتی ہے۔ مادی طور پر کامیابی حاصل کرنے کے باوجود بھی انسان خود کو ذہنی طور پر بے سکونی کی حالت میں پاتا ہے۔ مثلاً امریکا کے بل گیٹس (Bill Gates) کے لیے اس کی دولت تسکین کا ذریعہ نہیں بنی تو اس نے اپنی دولت کا بڑا حصہ چیرٹی میں دے دیا۔ امریکا کے سابق صدر ڈونالڈ ٹرمپ (Donald Trump) کو وائٹ ہاؤس میں پہنچ کر سکون نہیں ملا۔ چنانچہ اس نے وائٹ ہاؤس کو گویا آب ریشم (cocoon) بتایا، وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے معیار پسند (perfectionist) ہے۔

جب کہ موجودہ دنیا ہر اعتبار سے غیر معیاری (imperfect) ہے۔ اس صورت حال نے انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک تضاد پیدا کر دیا ہے۔ اسی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی انسان ہر قسم کے دنیوی سامان کو حاصل کرنے کے باوجود مطمئن نہیں ہوتا۔ دنیا کی ہر چیز اُس کو اپنے ذہنی معیار سے کم تر معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ان کو پا کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ بظاہر راحت کے سامان کے درمیان بھی وہ ہمیشہ ایک قسم کے غیر شعوری عدم اطمینان میں مبتلا رہتا ہے۔

فطرت کا یہ قانون ثابت کرتا ہے کہ دنیوی راحت کے سامانوں میں ذہنی سکون تلاش کرنا ایک ایسا بے سود عمل ہے جو کبھی کار آمد بننے والا ہی نہیں۔ اس مسئلہ کا واحد ممکن حل وہی ہے، جس کو دین میں قناعت (contentment) کہا گیا ہے۔ حدیث میں مومن کی مثال مسافر سے دی گئی ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6416)۔ مسافر کا معاملہ کیا ہے، وہ اپنے آپ کو سفر کی حالت میں سمجھتا ہے، اِس لیے وہ تنگی اور پریشانی کے باوجود سفر کے وقت، یا سواری میں بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا ہے۔ اِسی حقیقت پسندانہ سوچ کا نام قناعت (contentment) ہے۔ یعنی آدمی صورتِ موجودہ پر دل سے راضی ہو جائے۔

دنیا میں جب بھی کوئی شخص صحیح اصول کے مطابق کمانے کی کوشش کرے تو وہ ضرور اتنی معاش حاصل کر لیتا ہے جو اس کی ضرورتوں کے لیے کافی ہو۔ اگر وہ اس ملے ہوئے پر راضی ہو جائے تو اس کا فائدہ اس کو ذہنی سکون کی صورت میں ملے گا۔ لیکن سکون ہمیشہ قناعت سے ملتا ہے اور قناعت کا مطلب ہے ملے ہوئے پر راضی ہو جانا۔

صحابیٔ رسول سعد بن ابی وقاص نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے میرے بیٹے، جب تم مال طلب کرو تو اس کو قناعت کے ساتھ طلب کرو۔ کیوں کہ جس کے اندر قناعت نہ ہو مال اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتا: قَالَ سَعْدُ بْنُ أَبِي وَقَّاصٍ لِابْنِهِ: يَا بُنَيَّ! إِذَا طَلَبْتَ الْغِنَى، فَاطْلُبْهُ بِالْقَنَاعَةِ، فَإِنَّهُ مَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ قَنَاعَةٌ لَمْ يُغْنِهِ مَالٌ (تاریخ دمشق لابن عساکر، جلد 20، صفحہ 363)۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُنْ قَنِعًا، تَكُنْ أَشْكَرَ النَّاسِ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4217)۔ یعنی، قناعت کرنے والے بنو، تم سب سے زیادہ شکر کرنے والے بن جاؤ گے — شکر گزاری کا جذبہ انسان کے اندر پیس آف مائنڈ پیدا کرتا ہے۔

ڈائری 1986

16 اپریل 1986

آج ابوبکر نجار (جنوبی افریقہ) ملنے کے لیے آئے۔ ان کا پورا پتہ یہ ہے۔

Shaikh Aboubaker Najaar
President, Islamic Council of South Africa,
12, Elwyn Road, Craw ford, Cape,
P.O. Box 200, Athlone 7760, SA

جناب ابوبکر نجار صاحب نے بتایا کہ جنوبی افریقہ کی کل آبادی 30 ملین ہے۔ اس میں نصف ملین مسلمان ہیں۔ مسلمانوں نے وہاں کے قادیانی فرقہ کے خلاف مقامی عدالت میں مقدمہ کیا تاکہ قادیانیوں کو اپنی مساجد اور دینی مقامات میں آنے سے روک دیں۔ مگر عدالت نے خلاف فیصلہ دیا اور اب قادیانی پہلے کے مقابلہ میں زیادہ دلیری سے مسلمانوں کے مذہبی مقامات میں آنے لگے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کا مسئلہ اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہاں کی عدالت میں تعصب ہے؟ انہوں نے کہا کہ بالکل نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مسلمان اپنے کیس کی مضبوط وکالت نہ کرسکے۔ چنانچہ اب وہاں کے مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ مسلم ملکوں سے چندہ وصول کر کے دوبارہ سپریم کورٹ میں اس عدالتی فیصلہ کو چیلنج کریں۔

گفتگو کے دوران میں نے ابوبکر نجار صاحب سے پوچھا کہ کیا ساؤتھ افریقہ میں غیر مسلموں کے درمیان کچھ تبلیغی کام ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا نہیں۔

"Tabligh work among non-Muslims is virtually non-existent."

مزید سوالات کے دوران انہوں نے بتایا کہ غیر مسلموں میں تبلیغی کام نہ ہونے کے باوجود لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ خاص طور پر بلیک کمیونٹی میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کافی ہے۔

یہی صورت حال تقریباً ساری دنیا میں ہے۔ خالص کمیونسٹ ملکوں کو چھوڑ کر ہر جگہ یہ صورت حال ہے کہ مسلمان تبلیغی کام تو بالکل نہیں کرتے۔ مگر اس کے باوجود ہر ملک میں روزانہ لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔

ایک طرف مسلمانوں کی وہ سرگرمیاں ہیں، جن کا مطلق کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ دوسری طرف دعوت کے میدان میں اسلام ہر روز اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ مگر مسلمانوں کے لیے اس میں کوئی سبق نہیں۔

17 اپریل 1986

ایسٹ برلن (جرمنی) کے ایک کلب میں دھماکہ ہوا جس میں کچھ امریکی باشندے ہلاک ہو گئے۔ صدر امریکہ مسٹر ریگن نے اعلان کیا ہے کہ یہ لیبیا کے صدر معمر قذافی کی دہشت پسندانہ اسکیم کے تحت ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے انتقامی کارروائی کے لیے اپنی فوجوں کو حکم دے دیا۔ اپریل 1986 میں امریکی جہاز لیبیا کی فضا میں پہنچے اور طرابلس (باب العزیزیہ) پر بمباری کی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں معمر قذافی کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس واقعہ پر ساری دنیا میں شدید ردعمل ہوا۔ نئی دہلی کے اخبار انڈین اکسپریس (17 اپریل 1986) کے اداریہ کا عنوان یہ تھا:

Shameful Aggression

(شرمناک جارحیت)۔ اس اداریہ کا آغاز ان الفاظ میں کیا گیا تھا:

‘‘Shock, anger, disgust and alarm. These words sum up the reaction of much of the world to the naked and unprovoked attack the United State launched on Libya.’’

ہزار سال پہلے اس قسم کا واقعہ سیاسی دنیا میں معمول کا ایک واقعہ تھا۔ اس وقت اس قسم کے واقعہ پر نہ کوئی ردعمل ظاہر کیا جاتا تھا اور نہ آج کل کی طرح پریس کے ذرائع تھے کہ منٹوں میں اس کی خبر ساری دنیا میں پھیل جائے اور لوگوں کے بیانات چھپ کر ہر جگہ پہنچ جائیں۔

یہ زمانہ کا فرق ہے۔ اس فرق نے موجودہ زمانہ میں اسلام کی دعوت کے لیے ایسا نیا امکان کھول دیا ہے جو اس سے پہلے کبھی دنیا میں موجود نہ تھا۔ مسلمان اگر اشتعال انگیزی سے بچیں تو وہ جارحیت کے اندیشے کے بغیر ساری دنیا میں اسلام کی دعوت پھیلا سکتے ہیں۔ (2004 میں رونالڈ ریگن کا اور 2011 میں کرنل معمر قذافی کا انتقال ہو چکا ہے)۔

18 اپریل 1986

لیبیا پر امریکہ کا حملہ آج کل اخبارات کے صفحہ اول کی خبر بنا ہوا ہے۔ نئی دہلی کے انگریزی

اخبار ٹائمس آف انڈیا (18 اپریل 1986) کے صفحہ اول کی پہلی خبر کی سرخی یہ تھی:

"Soviet warship takes up position in the Gulf of Sidra."

سویت روس کے سمندری جنگی جہازوں نے خلیج سدرہ میں پوزیشن لے لی۔

یہ خبر بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلم ممالک کسی کی حمایت کے بل پر زندہ ہیں۔ آج ان کی اپنی ذاتی کوئی قوت نہیں۔ وہ صرف اس لیے زندہ ہیں کہ مغرب کی بڑی طاقتیں اپنی قوت کے ذریعہ ان کی سرپرستی کرتی ہیں۔ لیبیا کا سرپرست روس ہے، سعودی عرب کا سرپرست امریکہ۔ اور اسی طرح دوسرے مسلم ممالک۔

قرآن مجید میں یہود کے بارے میں آیا ہے کہ انہیں کبھی مستقل قوت حاصل نہ ہوگی۔ وہ یا تو اللہ کی رسی کے ساتھ رہیں گے یا لوگوں کی رسی کے ساتھ (3:112)۔ "اللہ کی رسی" سے مراد یہاں اسلامی حکومت ہے اور "لوگوں کی رسی" سے مراد غیر مسلم اقوام کی حکومت۔

یہود کے بارے میں یہ قرآنی پیشین گوئی مسلسل صحیح ثابت ہورہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ان کی حکومت (اسرائیل) امریکہ کی سرپرستی کے بل پر زندہ ہے۔ مگر مسلمانوں کا حال بھی موجودہ زمانہ میں اس سے مختلف نہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلم ممالک اپنی کوئی ذاتی قوت نہیں رکھتے۔ وہ سب کسی نہ کسی غیر مسلم بڑی طاقت کی حمایت کے تحت زندہ ہیں۔ کوئی ملک روس کی حمایت کے تحت زندہ ہے اور کوئی امریکہ کی حمایت کے تحت۔

19 اپریل 1986

ایک صاحب جماعت اسلامی کے پرانے رکن ہیں۔ وہ جماعت کی مجلس نمائندگان کے ممبر ہیں، وغیرہ۔ وہ مجلس نمائندگان کے اجتماع کے تحت دہلی آئے تھے۔ اس درمیان وہ مجھ سے بھی ملنے کے لیے آئے۔ ان سے گفتگو کے دوران ہندستان کے ایک معروف عالم دین کا ذکر آیا۔ میں نے مذکورہ عالم دین کی بعض باتوں کی تعریف کی۔ انھوں نے اپنا تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کے اندر قیادت کی مطلق صلاحیت نہیں۔ وہ زمانہ کو نہیں پہچانتے اور جس آدمی کے اندر زمانہ کی پہچان نہ ہو تو وہ کبھی قائد نہیں بن سکتا۔

میں نے پوچھا کہ زمانہ کی پہچان سے آپ کی کیا مراد ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کل یوپی

میں اور دوسرے مقامات پر بابری مسجد (اجودھیا) کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے۔ تمام مسلمان اس مسئلہ پر سخت مشتعل ہیں۔ مگر مذکورہ عالم دین کا حال یہ ہے کہ وہ اس معاملہ میں کچھ بولتے نہیں۔ کئی اجتماعات میں ان سے بابری مسجد کے بارے میں سوال کیا گیا مگر وہ خاموش رہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس وقت جو شخص بابری مسجد کا مسئلہ لے کر اٹھے گا وہ مسلمانوں کا قائد بن جائے گا۔

میں نے سوچا کہ زمانہ کی پہچان کے بارے میں لوگوں کا نظریہ کتنا ناقص ہے۔ یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ قائد کو زمانہ کی پہچان ہونی چاہیے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بابری مسجد جیسے مسائل کو لے کر دھواں دار تقریریں کرنے لگے۔

زمانہ کو پہچاننے سے مراد یہ ہے کہ ان قوتوں کو پہچانا جائے جنھوں نے زمانہ میں فیصلہ کن حیثیت حاصل کی ہے۔ جذباتی ابال اور چیز ہے اور زمانی حقیقتیں بالکل دوسری چیز۔ قائد کے لیے بلاشبہ ضروری ہے کہ وہ زمانی حقیقتوں کو جانے، اس کے بغیر وہ اپنی قوم کی صحیح رہنمائی نہیں کرسکتا۔

20 اپریل 1986

ہندستان کے موجودہ حکمراں نہایت پرجوش طور پر ہندستان کو کمپیوٹر ایج میں داخل کر رہے ہیں۔ شاید ان کا خیال ہے کہ صرف اس کام سے ان کا ملک کمپیوٹر ایج میں داخل ہو جائے گا کہ مغربی ملکوں سے کمپیوٹر منگائے جائیں اور ان کو ملک کے ہر بڑے دفتر میں نصب کر دیا جائے۔ حالانکہ یہ مغالطہ کے سوا کچھ نہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (19 اپریل 1986) میں مسٹر ایس ایس گل نے اس ذہنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے نہایت صحیح طور پر لکھا ہے:

> ‘‘Modern management techniques and computerized office equipments are only aids to efficient management. They are no substitutes for systems or structures.’’

جدید انتظامی طریقے اور دفتری کمپیوٹر صرف مستعد انتظامیہ کے لیے مددگار ہیں، وہ نظام یا ڈھانچہ کا بدل نہیں۔ انہوں نے اپنے مفصل آرٹیکل میں دکھایا ہے کہ موجودہ حالت میں ہندستان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ دفتروں میں کام کرنے والے کام نہیں کرتے۔ سرکاری دفاتر میں ڈیوٹی کے احساس کی آخری حد تک کمی ہے۔ ایسی حالت میں کمپیوٹر لگانے کا کیا فائدہ ہوگا، جب کہ کمپیوٹر کو استعمال کرنے والے ہاتھ اپنے حصہ کا کام ذمہ دارانہ طور پر نہ کریں۔ انہوں نے دلچسپ طور پر یہ جملہ لکھا ہے:

“A racing car, pulled by bullocks, will not move faster than a bullock cart.”

ایک تیز رفتار کار جس کو بیل کھینچ رہے ہوں، وہ بیل گاڑی سے زیادہ تیز نہیں چل سکتی۔

یہی تبصرہ مختلف صورتوں میں خود اسلامی ممالک پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ مثلاً افراد کی ضروری تربیت کے بغیر ملک میں شرعی قانون کو لاگو کرنا، وغیرہ۔

22 اپریل 1986

پاکستان جن نعروں سے بنا ان میں سب سے اہم نعرہ یہ تھا:

پاکستان کا مطلب کیا — لا الٰہ الا اللہ

یہ مسلم لیگ کا نعرہ تھا۔ اس کے بعد جب پاکستان بن گیا تو کچھ دینی جماعتوں اور دینی قائدین نے یہ کہنا شروع کیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اس لیے یہاں اسلامی قانون کی حکومت ہونی چاہیے۔ ایک دینی رہنما نے مزید یہ دعویٰ کیا کہ پاکستان کی عظیم اکثریت اسلام چاہتی ہے۔ صرف تھوڑے لوگ ہیں جو اتفاقاً حکومت پر قابض ہو گئے ہیں وہی غیر اسلام چاہتے ہیں۔

مگر پاکستان میں سیکولر پارٹیوں کا غلبہ ثابت کرتا ہے کہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔ مثلاً 1 اپریل 1986 میں بے نظیر بھٹو لندن سے لاہور پہنچی تو لاہور کے لوگ ان کے استقبال کے لیے امنڈ پڑے۔ سڑکوں پر یہ نعرہ لگ رہا تھا:

پاکستان کی تقدیر — بے نظیر بے نظیر

(ٹائمس آف انڈیا، 20 اپریل 1986)۔ بے نظیر بھٹو اوران کی پارٹی کا نظریہ واضح طور پر غیر مذہبی ہے۔ آج بے نظیر بھٹو کو پاکستان میں اتنی مقبولیت حاصل ہے کہ جماعت اسلامی جیسی دینی جماعتیں الیکشن کے میدان میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، یہاں تک کہ جنرل ضیاء الحق بھی نہیں۔

اسی طرح سیاست کے علاوہ دوسرے میدانوں میں بھی غیر دینی عناصر، خواہ وہ مثبت ہو یا منفی، کا غلبہ ثابت کرتا ہے کہ واقعہ وہ نہیں ہے، جیسا کہ وہاں کے کچھ دینی رہنما دعویٰ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا ہے، وہ اسلام کے نام پر غیر حکیمانہ سیاست چلانے کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ ایسی سیاست کا انجام وہی ہوسکتا تھا جو ہوا۔

23اپریل1986

ایک نوجوان ملنے کے لیے آئے، جن کا نام و پتہ یہ ہے:

Suhrab Alam
Aftab Book Depot, Sabzi Bagh, Patna-4

انہوں نے بتایا کہ میری زندگی اس سے پہلے بہت زیادہ غلط تھی۔ لوگ مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ اس کے بعد مجھے آپ کی کتاب ''انسان اپنے آپ کو پہچان'' ملی۔ اس کو پڑھ کر میری زندگی بالکل بدل گئی۔ اس کے بعد میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ انہوں نے کہا کہ ''پیغمبر انقلاب'' میں آپ نے جو منتخب حدیثیں لکھی ہیں ان کو میں نے پڑھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں بالکل نئی حدیثیں پڑھ رہا ہوں، ایسی حدیثیں جن کو میں نے کبھی پڑھا نہیں تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی کہانی ابھی تک اَن کہی کہانی (untold story) بنی ہوئی ہے۔ 21 اپریل 1986ء کو بھوپال میں میری ایک تقریر تھی، جس میں کثرت سے ہندو صاحبان موجود تھے۔ اس موقع پر میں نے کہا کہ 1962ء کی ہند-چین جنگ کے بعد حکومت کی طرف سے بہت سے بیانات اور دستاویزیں شائع ہوئے۔ اس کے بعد ہندستانی فوج کے ریٹائرڈ لفٹننٹ جنرل مسٹر برج موہن کول (وفات 1972ء) نے اعلان کیا کہ ہند- چین کی کہانی کا اصل باب ابھی غیر بیان شدہ پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے— اَن کہی کہانی:

''*The Untold Story*, Allied Publishers, 1967''

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں بھی آج آپ کو اسلام کی Untold Story سنانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے وہ حدیثیں سنائیں جن کا تعلق توحید، اخلاق، عدل، مساوات انسانی اور دوسرے امورِ خیر سے ہے۔ ہندو مسلم دونوں بہت متاثر ہوئے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے مقامی صدر مسٹر سارنگ نے تقریر کے بعد کھڑے ہو کر کہا کہ یہ تو وہ اسلام ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اختیار کر لینا چاہیے۔

ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ اسلام کے تعارف پر اسی انداز پر ایک کتاب تیار کی جائے اور اس کا نام Untold Story ہو۔

24اپریل1986

امریکہ کے لیے لیبیا کے معمر قذافی کی ’’دہشت پسندی‘‘ پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھی۔ امریکہ کے صدر ریگن نے اس کے خلاف بار بار وارننگ دی اور پھر اپریل1986 میں طرابلس پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں معمر قذافی کی رہائش گاہ کونشانہ بنایا گیا تھا۔ ہوائی بمباری سے کافی نقصان ہوا۔ تاہم معمر قذافی بچنے میں کامیاب ہوگئے۔

اس کے فوراً بعد معمر قذافی ساری دنیا کے اخبارات میں صفحہ اول پر چھپ رہے تھے۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر ان کی امیج کافی بڑھ گئی۔ امریکہ اپنے مقصد میں ناکام رہا اور معمر قذافی اپنے مقصد میں کامیاب۔ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر (پیدائش 1942ء) نے لیبیا پر امریکی بمباری کو ایک غلطی (mistake) قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ:

"Col. Gaddafi was an outcaste. Now he is a hero." (*Times of India*, 20 April 1986)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی کے خلاف عملی اقدام ایک بے حد نازک معاملہ ہے۔ اس کو حد درجہ سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت ہونا چاہیے۔ اگر ناقص اندازہ کی بنیاد پر اقدام کیا گیا تو وہ کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter-productive) ثابت ہوگا۔ یعنی اس کا نتیجہ اس کے برعکس نکلے گا جو اقدام کرنے والے نے بطور خود اپنے ذہن میں فرض کرلیا تھا۔ خواہ اقدام کرنے والا امریکہ جیسا طاقتور ملک ہی کیوں نہ ہو اور جس کے خلاف اقدام کیا گیا ہے وہ لیبیا جیسا کمزور ملک۔

25اپریل1986

پاکستان کے ایک اخبار میں ایک کتاب ’’قادیانیوں سے خطاب‘‘ کا اشتہار نظر سے گزرا۔ اس اشتہار کے الفاظ یہ ہیں:

’’انسداد قادیانیت آرڈننس کے بعد قادیانی اب پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دیے جاچکے ہیں تو اب پاکستانی مسلمانوں پر یہ فرض پہلے سے بھی زیادہ شدت سے عائد ہوتا ہے کہ قادیانیوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ اور قادیانی دجل کا پردہ چاک کریں۔ اسی فرض کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کتاب تیار کی گئی ہے۔ اس کو فی الفور منگوا کر اپنے حلقہ

کے قادیانیوں میں تقسیم کر کے ایک اہم دینی فریضہ پورا کریں‘‘۔(ہفت روزہ المنبر، فیصل آباد، 15 مارچ 1986)

مسلمان موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کا نام لیتے ہیں، مگر ان کے اکابر تک اس سے بے خبر ہیں کہ اسلامی دعوت حقیقتاً کیا ہے۔ وہ ’’اسلامی دعوت‘‘ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ’’غیر مسلموں کے دجل یعنی سازش کا پردہ چاک‘‘ کیا جائے۔ حالانکہ اس قسم کے معاملہ کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لفظی کُشتی ہے، نہ کہ اسلامی دعوت۔

اسلامی دعوت سراسر ایک خیر خواہی کا عمل ہے۔ اس کا سرچشمہ داعی کا یہ درد ہے کہ وہ ایک بھٹکے ہوئے انسان کو راہ راست پر لے آئے۔ یہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے محبت کا عمل ہے، نہ کہ نفرت اور تحقیر کا عمل۔ لوگ دعوت اور مناظرہ بازی میں فرق نہیں کرتے، اس لیے وہ ایسے الفاظ بولتے ہیں، جس کا ایک نمونہ اوپر کے اقتباس میں نظر آتا ہے۔

26 اپریل 1986

مولانا کبیر الدین فاران (ہماچل پردیش) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ذہین آدمی ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میرے اندر تنقیدی مزاج ہے۔ مجھے کسی رائے سے اختلاف ہوتا ہے تو میں فوراً اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔

میں نے کہا کہ یہ مزاج بذات خود صحیح مزاج ہے۔ مگر مسلمان عام طور پر ’’اختلافِ رائے‘‘ اور ’’اختلافِ امر‘‘ میں فرق نہیں کرتے۔ اختلافِ رائے یعنی سوچ کا فرق اور اختلافِ امر یعنی عملی مخالفت۔ میرے نزدیک اختلافِ رائے ایک جائز عمل ہے، مگر اختلافِ امر بالکل ناجائز ہے۔ اختلافِ رائے اور اختلافِ امر میں فرق کی مثالیں اصحابِ رسول کے یہاں بھی موجود ہیں۔ حضرت عثمان کے زمانے میں صحابیِ رسول ابو ذر رضی اللہ عنہ حج کے لیے گئے۔ وہاں ان کو معلوم ہوا کہ خلیفہ ثالث عثمان رضی اللہ عنہ نے یہاں چار رکعتیں پڑھی ہے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے سخت الفاظ میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہوں۔ آپ نے صرف دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر ابو بکر و عمر کے ساتھ بھی میں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد ابو ذر رضی اللہ عنہ اٹھے اور چار رکعت نماز ادا کی۔ لوگوں نے کہا: آپ نے امیر المومنین پر

چار رکعت کے لیے اعتراض کیا اور خود وہی کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: اَلْخِلاَفُ أَشَدُّ (مسند احمد، حدیث نمبر 21460)۔یعنی، عملی مخالفت اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

اسی قسم کا واقعہ مشہور صحابیِ رسول عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ انھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے منیٰ میں چار رکعت پڑھنے پر بہت ہی سخت الفاظ میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور پھر خود چار رکعت پڑھی۔ جب پوچھا گیا تو فرمایا: اختلاف کرنا برا ہے (اَلْخِلاَفُ شَرٌّ) سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 1962۔اس کے برعکس، مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں رائے کے معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ امر اور نظم (system) سے اختلاف کرنا بھی ان کے لیے درست ہے۔اسی کمزوری کی وجہ سے مسلمانوں سے کوئی متحدہ کام نہیں ہو پاتا۔

حدیث ''اخْتِلافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ'' (المقاصد الحسنۃ للسخاوی، حدیث نمبر 39) کا مطلب بھی یہی ہے۔یعنی میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔اس حدیث میں اختلافی رائے کے اظہار کو رحمت کہا گیا ہے، نہ کہ عملی اختلاف وانتشار کو۔افراد کو ہر کام میں اجتماعی نظم کا پابند رہنا چاہیے۔البتہ اختلافِ رائے کو مثبت طریقے سے ظاہر کرنے کے معاملہ میں ان پر کوئی پابندی نہیں۔انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ کسی بھی شخص سے رائے کے معاملہ میں اختلاف کر سکتے ہیں خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔

27 اپریل 1986

مولانا حکیم بشیر حسن انصاری (محبوب نگر) مرکز میں تشریف لائے۔گفتگو کے دوران انہوں نے ایک لطیفہ بیان کیا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک نواب صاحب تھے، جن کا نام عبید تھا۔ایک روز نواب عبید اپنی شان وشوکت کے ساتھ نکلے۔ان کے جلوس میں ان کے خادم بھی زرق برق گھوڑوں پر سوار ہو کر چل رہے تھے۔خادموں کا حلیہ بتا رہا تھا کہ نواب نے اپنے خادموں پر بڑی عنایات کی ہیں۔ایک غریب شخص نے اس منظر کو دیکھا تو اپنے اور ان خادموں کے فرق کو دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ خدا سے کہہ اٹھا:

مولا شدن از عبید بیاموز

یعنی عبید نے اپنے خادموں کو کس طرح نواز رکھا ہے۔اور آپ میرے مولا ہیں اور میں آپ کا

خادم ہوں۔ مگر میں آپ کی نوازش سے محروم ہوں،’’مولا بننا آپ عبید سے سیکھیے‘‘۔

کچھ عرصہ بعد ایسا ہوا کہ نواب عبید اپنے خادموں سے کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ اور حکم دے دیا کہ ان کو کوڑے مارے جائیں۔ مذکورہ غریب شخص دوبارہ ادھر سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ خادموں پر کوڑے پڑ رہے ہیں۔ مگر وہ سب ’’عبید، عبید‘‘ پکار رہے ہیں۔ وہ جس سے مار کھا رہے ہیں، اس سے فریاد بھی کر رہے ہیں۔ اس وقت غیب سے آواز آئی:

بندہ شدن از بندگان عبید بیاموز

(بندہ ہونے کو عبید کے بندوں سے سیکھو)۔ یعنی تم خدا کا بندہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اور جب خدا کی طرف سے معمولی تکلیف پہنچی تو شکایت کرنے لگے۔ عبید کے بندے اس سے بڑی تکلیف اٹھا رہے ہیں، پھر بھی وہ شکایت کے بجائے اسی کو پکار رہے ہیں۔ وہ اسی کی طرف اپنی توجہ لگائے ہوئے ہیں۔

یہ اگرچہ ایک لطیفہ ہے، مگر اس میں منصوبۂ تخلیق کا ایک بڑا سبق چھپا ہوا ہے۔

28 اپریل 1986

ٹائمس آف انڈیا (28 اپریل 1986) صفحہ 8 پر ایک خبر حسب ذیل سرخی کے ساتھ چھپی ہے:

‘‘USSR had alerted Libya against the raid.’’

یہ خبر جس کی ڈیٹ لائن قاہرہ کی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ واشنگٹن نے لیبیا پر اپنے حملہ (15 اپریل 1986) سے ایک گھنٹہ پہلے سوویت یونین کو باخبر کر دیا تھا۔ سوویت یونین نے فوراً اس کی اطلاع کرنل قذافی کو کر دی۔ یہی پیشگی اطلاع تھی جس کی بنا پر امریکہ کا حملہ ناکام ہو گیا۔

خبر میں امریکی حملہ کو ’’Biggest American Mistake‘‘ کہا گیا ہے۔ پیشگی اطلاع پا کر کرنل قذافی نے فوراً دو اقدامات کیے۔ انھوں نے اپنے جنگی جہازوں کو پڑوسی ملک سوڈان میں بھیج دیا۔ اور خود اپنی رہائش گاہ عزیزیہ کیمپ سے منتقل ہو کر دوسری جگہ چلے گئے۔ اس طرح کرنل قذافی خود بھی حملہ سے محفوظ رہے اور ان کے روسی ساخت کے جنگی جہاز بھی۔

یہ انکشاف مسٹر صلاح منتصر نے کیا ہے جو اکتوبر میگزین (قاہرہ) کے اڈیٹر ہیں۔ یہ خبر اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کو اس کی ترقیوں نے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی

(over confidence) میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہمیشہ آدمی کے لیے الٹی پڑتی ہے۔ خواہ وہ امریکہ جیسی سپر پاور کیوں نہ ہو۔

29 اپریل 1986

موجودہ زمانہ میں مسلم لیڈروں نے مسلمانوں کو صرف ایک ہی بات بتائی ہے۔ اور وہ ہے— اپنے مسائل کے لیے دوسروں سے لڑنا۔ جو مسئلہ اپنی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو اس کو دوسروں کے اوپر ڈالنا۔ شاہ بانو بیگم کا کیس (1985ء) کے سلسلے میں تمام مسلم لیڈروں نے متحدہ طور پر سپریم کورٹ اور حکومت کے خلاف پرشور مہم چلائی۔ یہ میرے نزدیک قوم کے ساتھ غداری ہے۔ کیوں کہ اس سے مذکورہ ذہن مزید پختہ ہو جاتا ہے۔

اس کو ایک تقابلی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ نظام الدین ویسٹ (نئی دہلی) میں ہمارے مکان کے سامنے ایک ہندو بیوہ عورت ہے۔ وہ گھروں کے دھلے ہوئے کپڑے پریس کرتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کام سے وہ روزانہ 70-60 روپے کما لیتی ہے۔ یعنی تقریباً دو ہزار روپے مہینہ۔ اس کے مقابلہ میں شاہ بانو بیگم کو لیجیے۔ وہ سات برس تک مقدمہ لڑتی رہی۔ اس کے بعد عدالت نے اس کو 180 روپے ماہوار دیے جانے کا فیصلہ کیا۔ اب غور کیجیے کہ دونوں میں سے کون زیادہ فائدہ میں ہے۔ شاہ بانو بیگم کے اندر اگر تعمیری مزاج ہوتا تو وہ کسی مفید کام میں مشغول ہو کر زیادہ نفع حاصل کر سکتی تھی۔ مگر اس کو اس کے معاشرے نے صرف لڑائی جھگڑے کا ذہن دیا تھا۔ چنانچہ وہ شوہر سے علیحدگی کے بعد اس سے مسلسل لڑتی رہی اور بالآخر اس کے حصے میں نقصان کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ کریمنل پروسیجر کوڈ کی دفعہ 125 نہیں ہے۔ جس کے خلاف ہمارے تمام اکابر جہاد کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔ بلکہ لڑائی بھڑائی کا وہ ذہن ہے جس کے سب سے زیادہ ذمہ دار خود ہمارے یہی لیڈر ہیں۔ مسلم لیڈروں کا حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر تعمیری مزاج پیدا کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ البتہ حکومت کے خلاف مہم چلانے کا کوئی شوشہ انہیں ہاتھ آ جائے تو اس پر خوب جوش دکھاتے ہیں۔ ان کی یہی سیاست ہے جس نے مسلمانوں کے اندر اِس سرے سے اُس سرے تک تخریبی مزاج (destructive behaviour) پیدا کر دیا ہے۔ مسلمان اس قابل ہی

نہیں رہے ہیں کہ وہ مثبت انداز میں سوچیں اور تعمیری انداز میں کچھ کریں۔

30 اپریل 1986

ہندستان میں 20 ہزار اخبارات نکلتے ہیں، جن کی مجموعی اشاعت (circulation) 50 ملین ہے۔ یہ تعداد 1952ء کے مقابلہ میں چوگنی زیادہ ہے۔

خالص قانونی اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندستان کے اخبارات بھی اتنا ہی آزاد ہیں جتنا کہ امریکہ یا جاپان یا مغربی یورپ کے اخبارات۔ مگر عملاً یہ بات درست نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کا اخبار نویس اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی پوزیشن میں ہے۔ جب کہ ہندستان کا اخبار نویس اس پوزیشن میں نہیں۔

دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کا اخبار نویس اتنا دولت مند ہوتا ہے کہ اس کو کم از کم چھوٹی موٹی رشوتوں سے خریدا نہیں جاسکتا۔ جب کہ ہندستان کا حال یہ ہے کہ رعایتی قیمت پر ایک پلاٹ، کم شرح پر ایک فلیٹ یا یورپ کا ایک تفریحی سفر (pleasure trip) بھی اس کے قلم کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ہندستان کے تاجر اور یہاں کی حکومت دونوں اخبار نویس کو مذکورہ قسم کی رشوتیں دے کر پریس کی قانونی آزادی کو خرید رہے ہیں۔

انڈین اکسپریس (30 اپریل 1986ء) کے ایک آرٹیکل میں بتایا گیا ہے کہ دہلی کے بہت سے انگریزی اخبار نویس بڑے بڑے تاجروں سے باقاعدہ رقمیں پاتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کے موافق چیزیں لکھیں اور چھاپیں۔

اتر پردیش کی حکومت نے پانچ اخبار نویسوں کو یورپ کے تفریحی سفر پر روانہ کیا۔ ان کو چیف منسٹر کے ریلیف فنڈ اور جرنلسٹس ویلفیئر فنڈ سے پندرہ ہزار روپے فی اخبار نویس دیے گئے۔ نیز ان کو پستول برآمد کرنے کا لائسنس دیا گیا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ باہر سے پستول خرید کر لائیں اور ہندستان میں اس کو فی پستول پندرہ ہزار روپے نفع کے ساتھ بیچ دیں۔

کسی حق سے فائدہ اٹھانا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ اس کے موافق حالات بھی لوگوں کے لیے موجود ہوں۔

11 مئی 1986

آج میں نے سورہ القمر کی تفسیر مکمل کی ہے۔ اس سورہ میں یہ آیت چار مرتبہ (آیت نمبر 17, 22, 32, 40) آئی ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ

(اورہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کو ایک مشکل پیش آئی ہے۔ اگر اس کا مفہوم ظاہری الفاظ کے لحاظ سے یہ لیا جائے کہ قرآن سے نصیحت حاصل کرنا بالکل آسان ہے تو ایک شخص کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ قرآن میں، معاذ اللہ، گہرے معانی موجود نہیں ہیں، یہ صرف عام لوگوں کی کتاب ہے۔ اور اگر یہ مانا جائے کہ قرآن میں گہرے حقائق ہیں جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے کہ لَا تَنْقَضِي عَجَائِبُه (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2906)، یعنی اس کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے، تو پھر تفسیر کی معنویت بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جن مفسرین نے اس آیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی لمبی لمبی عبارتوں کے باوجود متعین طور پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آیت کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن مفسرین نے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس آیت کا مفہوم بتانے کی کوشش کی ہے، انھوں نے آیت کو اور زیادہ مشکل بنا دیا ہے۔

اسی الجھن کی بنا پر ایسا ہوا کہ میں نے سورہ القمر کی پوری تفسیر لکھ لی، مگر اس آیت کی تفسیر لکھنے سے رہ گئی۔ آج جب کہ تفسیر کے خاتمہ پر اس آیت کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مضمون کا گویا القا ہوا اور دل نے کہا کہ یہی اصل تفسیر ہے۔ ''تذکیر القرآن'' میں یہی تفسیر حسب ذیل الفاظ میں درج ہے:

''قرآن اگرچہ گہرے معانی کی کتاب ہے۔ مگر اس کے انداز بیان میں حد درجہ وضوح (clarity) ہے۔ اس وضوح کی بنا پر قرآن کا سمجھنا ہر آدمی کے لیے آسان ہو گیا ہے۔ خواہ وہ ایک عام آدمی ہو یا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی''۔

تذکیر القرآن کی ترتیب کے سلسلے میں مجھ کو اس طرح کے تجربے بار بار پیش آئے ہیں۔

زندگی کے قیمتی سال

(نئے سال کا پیغام)

آدمی کی اوسط عمر اس دنیا میں تقریباً ستر سال ہے۔ بڑھاپے کی عمر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اولڈ از گولڈ (old is gold)۔ یہ قول لفظ بلفظ صحیح ہے۔ بڑھاپے کی عمر میں آدمی سب سے زیادہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے بعد والوں کو اپنا بہترین (best) دے سکے — زیادہ معلومات، زیادہ تجربہ، زیادہ دانش مندی، زندگی کی زیادہ بہتر پلاننگ۔ یہ سنہری موقع ہر اس انسان کے لیے ہے، جس کی عمر زیادہ ہو جائے، بشرطیکہ وہ اس دنیا میں بااصول انسان (man of principle) بن کر زندگی گزارے:

(1) وہ صحت کے فطری اصول کا پابند ہو، تا کہ وہ اپنی عمر کے آخر دور تک دنیا میں قابلِ کار بنا رہے۔

(2) وہ سادہ زندگی گزارے، اور اپنے آپ کو اسراف سے بچائے۔

(3) وہ کسی حال میں اپنے آپ کو کسی غلط عادت میں مبتلا نہ ہونے دے۔

(4) وہ ہر حال میں مثبت سوچ (positive thinking) کا طریقہ اختیار کرے، حتی کہ وہ منفی تجربہ کو مثبت سبق میں تبدیل کر سکے۔

(5) وہ کسی سے امید نہ رکھے۔

(6) وہ اس دنیا میں دینے والا بن کر رہے، نہ کہ لینے والا۔

(7) وہ غصہ سے اس طرح بچے جس طرح کوئی شخص اپنے آپ کو سانپ بچھو سے بچاتا ہے۔

(8) وہ سچے دل سے لوگوں کا خیر خواہ بنے۔

(9) اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لے، وہ ایسا ہر گز نہ کرے کہ اپنی غلطی کے لیے عذر (excuse) پیش کرنا شروع کر دے۔

(10) وہ لوگوں کے درمیان ہمیشہ متواضع (modest) بن کر رہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز– 281

1۔ سی پی ایس انٹرنیشنل کا اہم مقصد یہ ہے کہ ساری دنیا میں قرآن کو انسان کی قابلِ فہم زبانوں میں عام کیا جائے۔ اس مقصد سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے، وہ ذیل کے تاثر سے معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ تاثر ایک اسپینی خاتون نے دیا ہے۔ ان کو اسپینی ترجمۂ قرآن عرب امارات میں ایک سی پی ایس ممبر نے دیا تھا:

‘‘The Quran in Spanish is a blessing. I am very grateful to have the word of God in my language and physical form. It is very easy to understand and makes you want to read it. I think it is very important that each person has a Qur'an in their language. It feels very comfortable and pleasant to have it. For example, I don't speak English very well or Arabic. I got it on the internet, but seeing it, touching it, and being able to read it without language restrictions is wonderful.’’

2۔ مسٹر طارق عزیز کولکاتا میں رہتے ہیں، اور ایم بی بی ایس کے اسٹوڈنٹ ہیں، ان کو جو فائدہ حاصل ہوا ہے، وہ انھوں نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

‘‘Mualana Wahiduddin khan's lectures have taught me the art of my anger and ego management.’’ (tarikaziz****@gmail.com)

3۔ سی پی ایس سہارن پور کی ٹیم نے 2 دسمبر 2023 ایم ایم انٹرنیشنل اسکول سہارن پور میں منعقد انٹر فیتھ پروگرام میں ڈاکٹر محمد اسلم خاں کی سرپرستی میں حصہ لیا۔ وہاں انھوں نے بتایا کہ اسلام کا مشن لوگوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ قرآن یہی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہ بھی ایک غلط فہمی ہے کہ قرآن کسی خاص قوم کی کتاب ہے، قرآن تمام انسانوں کی کتاب ہے۔ اس لیے تمام لوگوں کو قرآن پڑھنا چاہیے۔ مز رینو (سہارن پور) اس سے پہلے مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابیں پڑھ چکی تھیں، انھوں نے بتایا کہ مولانا صاحب کی کتابیں ہمیں ایشور سے جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔ پروگرام کے اختتام پر تمام شرکا کے درمیان سی پی ایس کا اسپریچول لٹریچر تقسیم کیا گیا۔

4. On invitation from the Jesuit Priests of Ashirvad, accompanied by Abrar Mudasser. I attended a session on giving inputs for introducing a study of different religions at school and pre university level on 9th December 2023. There are 58 schools run by the Jesuits in Karnataka. The purpose they mentioned was to give an understanding

of all religions for helping the youth to be able to live in harmony and peace with fellow beings. Presented the points in two capacities: 1. As a representative of CPS Interational — Student of Maulana Saheb for Islamic studies and 2. As an educationist and counsellor. Introduced Maulana Saheb's contribution towards global peace and presenting Islam as it is from the original sources, as a religion of peace and a religion of nature. The difference between Muslim culture and Islam and the importance of explaining the spirit behind Islamic rituals and the creation plan to the students and staff was highlighted. The points and suggestions were well received. Literature was distributed to the participants. All praise be to Allah through whose blessings all good things are accomplished. May Allah grant you all well being of every kind and for always. Aameen. ~ Fathima Sarah, Karnataka CPS Chapter.

5۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب نے 2001ء میں افراد کے تزکیہ اور تربیت کے لیے سنڈے کلاس کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ہر اتوار کو ڈاکٹر فریدہ خانم اور ڈاکٹر ثانی اثنین خاں خطاب کرتے ہیں۔ یہ خطاب سی پی ایس انٹرنیشنل کے فیس بک پیج (www.fb.com/maulanawkhan) پر ہندستانی وقت کے مطابق ساڑھے دس بجے سے لائیو سنا جاسکتا ہے۔ 10 دسمبر کو ڈاکٹر فریدہ خانم نے خطاب کیا۔ ان کا موضوع تھا: خدا کے نام پر جنگ (Making War in the Name of God)۔ اس خطاب میں ڈاکٹر صاحبہ نے یہ واضح کیا کہ تمام پیغمبروں کے آنے کا مقصد انسانوں کو جنت کا راستہ دکھانا اور جہنم سے دور کرنا تھا۔ یہ مقصد بالکل بھی نہیں تھا کہ انسانوں کو مذہبی جنگ کے نام پر قتل کر کے ہمیشہ کے لیے اللہ کی رحمت یعنی جنت سے محروم کر دیا جائے۔ جیسا کہ آج کل کچھ مسلمان کر رہے ہیں۔ یہ روش آدم سے محمد تک تمام پیغمبر علیہم السلام کے مقصد کو جیوپرڈائز (jeopardize) کرنے کے ہم معنی ہے۔

6۔ سی پی ایس انٹرنیشنل (یو ایس چیپٹر) کے ممبر خواجہ کلیم الدین صاحب نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ دسمبر 2023 میں وسطی امریکا کے ملک ایل سیلواڈور کا دورہ کیا۔ تاکہ وہاں دعوتی امکانات کا جائزہ لے کر قرآن کا پیغام عام کیا جائے۔ ذیل میں ان کے اس دورہ کی کچھ باتیں ان کے الفاظ میں شیئر کی جا رہی ہیں:

Alhamdulillah, we (Bhatti Sahab and Nabi Sahab from Virginia) landed at San Salvador airport on time. A young Imam received us by the

name of Mahmoud. He took us to a very nice hotel named Beverly Hills. He gave us the whole week's program from 3rd to 10th December. During this trip, we came to Santa Ana as per the program given. Here, at a mosque, we were introduced to the community waiting for us. I gave a brief talk on delivering the message. We then had lunch and went downtown to distribute Quran with a group of people from the community consisting of young people. El Salvador is an excellent place for Quran distribution, as it is a highly welcoming and open society. (Khaja Kaleemuddin, CPS USA)

7۔ ملکی اورغیرملکی زبانوں میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابوں کے ترجمے کا کام جاری ہے۔مثلاً ’’مذہب اور جدید چیلنج‘‘ کا اب اسپینش زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔’’عظمتِ قرآن‘‘ کے منتخب حصوں کے ترجمے انگریزی زبان میں پہلے ہی شائع ہو چکے تھے۔اب یہ منتخب حصے عربی اور اسپینش زبانوں میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو گئے ہیں۔اس کے علاوہ ہندی، بنگالی، تامل، تیلگو، کنڑا، مراٹھی، آسامی، گجراتی اور انگریزی زبانوں میں بھی ترجمے کا سلسلہ جاری ہے۔انگریزی میں اب تک تقریباً 120 چھوٹی بڑی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔مثلاً ’’کتاب معرفت‘‘ اور ’’اسلام ایک تعارف‘‘۔ ہندی میں تقریباً 25 کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں، مثلاً ’’امن عالم‘‘۔ بنگالی میں 7 کتابوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں، مثلاً ’’اسلام دور جدید کا خالق‘‘۔ اسی طرح ساؤتھ انڈیا کی چاروں زبانوں میں سے تیلگو میں تقریبا 96 کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ مثلاً ’’دورِ دعوت‘‘ اور ’’پیغمبر انقلاب‘‘۔کنڑا میں 5 کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔مثلاً ’’اللہ اکبر‘‘۔ملیالم میں 14 کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں، مثلاً ’’قرآنک وزڈم‘‘۔اور تامل میں 10 کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں، مثلاً ’’راز حیات‘‘۔نارتھ ایسٹ کی مختلف زبانوں میں بھی ترجمہ کا کام جاری ہے۔مثلاً ’’قیامت کا الارم‘‘ (منی پوری)۔اسی طرح اب تک اردو کے علاوہ ’’تذکیر القرآن‘‘ کے 4 زبانوں (انگریزی، ہندی، تھائی، اور سندھی) میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ پشتو اور بنگلہ زبان میں ترجمہ کا کام جاری ہے۔اس کے علاوہ تقریباً 40 نیشنل اور انٹرنیشنل زبانوں میں قرآن کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ان تمام کتابوں اور تراجم قرآن کو سی پی ایس انٹرنیشنل کی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے۔ویب سائٹ وزٹ کرنے کے لیے ذیل میں دیے گئے QR کوڈ کو اپنے فون سے اسکین کیجیے۔

کتابوں کے لیے اس
QR کوڈ کو اسکین کریں ⇦

تراجم قرآن کے لیے اس
QR کوڈ کو اسکین کریں ⇦

रहमत वाले नबी का तरीक़ा

मक्का की फ़त्ह के बाद मक्का की बहुत सी औरतों ने रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के पास आकर इस्लाम क़बूल किया। उन्हीं में से एक अबू सुफ़ियान की बीवी हिन्द बिन्त उत्बा थीं। यह वही औरत है, जिसने उहुद की जंग में हज़रत हम्ज़ा की लाश की बेहुर्मती की थी। वह कई औरतों के साथ आई। उसने कहा कि अगर मैं मुहम्मद (स.) के सामने बोली तो वह मुझे पहचान लेंगे, और अगर उन्होंने पहचान लिया तो वह मुझे क़त्ल कर देंगे।

बैअत (दीक्षा) के वक़्त हिन्द ने नक़ाब से अपना चेहरा छिपा लिया। मगर वह ऊंचे ख़ानदान की औरत थी, इसलिए वह अपनी बड़ाई के एहसास से चुप न रह सकी। बैअत के अल्फ़ाज़ अदा करते हुए जब रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने औरतों से फ़रमाया कि यूं कहो कि हम अपनी औलाद को क़त्ल न करेंगे, तो हिन्द ने बेबर्दाश्त होकर गुस्ताख़ी के अल्फ़ाज़ कहे। उसके अल्फ़ाज़ अलग-अलग रिवायतों में इस तरह नक़्ल किए गए हैं:

- हिन्द ने कहा कि आपने उनको बद्र के दिन क़त्ल कर दिया इसलिए आप जानें और वे जानें।
- हमने छोटे पर उन्हें पाला और बड़े पर आपने उन्हें क़त्ल कर दिया।
- आप ख़ुद तो उनके बापों को क़त्ल करते हैं और हमको उनकी औलाद के बारे में नसीहत कर रहे हैं।

हिन्द ने इससे पहले भी बार-बार रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम की शान में गुस्ताख़ी की थी। ऊपर वाले वाक़िए में तो उसने आमने-सामने तौहीने-रिसालत की और ईशदूतत्व का अपमान किया। मौजूदा ज़माने के नाम-निहाद (तथाकथित) मुस्लिम लीडरों ने जो अपनी मर्ज़ी का इस्लाम बना रखा है, यही

इस्लाम अगर रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम का भी होता तो आप फ़ौरन हिन्द को क़त्ल करा देते। मगर आपने बैअत लेकर हिन्द को इस्लाम में दाख़िल कर लिया।

आज मुसलमानों से सबसे बड़ी चीज़ जो खोई गई है वह रहमत वाले नबी का यही तरीक़ा है।

नफ़रत, मुहब्बत

रिवायात में आता है कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम मदीना की मसजिदे-नबवी में बैठे हुए थे। आपके असहाब (साथी) भी वहां मौजूद थे। इतने में एक अ'राबी (देहाती) वहां आया। वह मसजिद के अंदर एक जगह खड़ा होकर पेशाब करने लगा। सहाबा उसको पकड़ने और मारने के लिए दौड़े। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने उन्हें रोका और कहा कि इसे छोड़ दो। जब अ'राबी पेशाब कर चुका तो आपने कहा कि एक बाल्टी पानी लो और जहां उसने पेशाब किया है वहां पानी बहा कर उसको साफ़ कर दो। इसके बाद आपने अ'राबी को बुलाया और नरमी के साथ उससे कहा कि देखो यह मसजिद है। यहां ख़ुदा का ज़िक्र और इबादत की जाती है। यह पेशाब वग़ैरह करने की जगह नहीं।

अ'राबी पर इस वाक़ए का बहुत असर हुआ। पहले उसका गंवारपन जागा हुआ था, अब उसका ज़मीर (अंतरात्मा) जाग उठा। वह उसी हालत में अपने क़बीले में वापस गया। वहां वह लोगों से दीवानावार कहता फिरता था कि देखो, मैं मदीना गया। वहां मैंने यह गंदा काम किया कि मुहम्मद की मसजिद में पेशाब कर दिया, पर उन्होंने सिर्फ़ यह किया कि जहां मैंने गंदा किया था उसको पानी से धो दिया। ख़ुदा की क़सम मुहम्मद ने न मुझको झिड़का और न वह मेरे ऊपर ग़ुस्सा हुए। अ'राबी का यह कहना उसके क़बीले वालों के लिए इस्लाम की

तबलीग़ बन गया। नतीजे में पूरा का पूरा क़बीला इस्लाम धर्म में दाख़िल हो गया। जिस क़बीले के एक आदमी ने मसजिद में आकर पेशाब कर दिया था, उसी क़बीले के तमाम आदमी दोबारा मसजिद में इसलिए आए कि मसजिद का एहतिराम (सम्मान) करें और उसमें एक ख़ुदा के आगे सज्दा करके अपनी फ़रमाँबरदारी और निष्ठा कर इज़हार करें।

यह रिसालत के दौर का वाक़िआ है। अब मौजूदा ज़माने के मुसलमानों को देखिए। 1831 में सय्यद अहमद शहीद बरेलवी को यह ख़बर मिली कि पंजाब के महाराजा रणजीत सिंह ने पंजाब की कुछ मसजिदों को अस्तबल बना दिया है। वहां उसके घोड़े बंधे होते हैं। यह ख़बर सुनने के बाद उन्हें इसकी तहक़ीक़ करने की ज़रूरत महसूस नहीं हुई। वह बहुत से मुसलमानों को लेकर पंजाब पहुंचे और रणजीत सिंह की फौजों से लड़ गए। इस लड़ाई में हज़ारों मुसलमान मारे गए। एक तज़किरानिगार ने लिखा है कि पंजाब की ज़मीन मुसलमानों के ख़ून से लाल हो गई।

1857 के ग़दर (या आज़ादी की लड़ाई) में यह वाक़िआ हुआ कि मुसलमान इस बात पर भड़क उठे कि उन्हें हुक्मरानों की तरफ से ऐसे कारतूस दिए गए हैं, जिनमें सुअर की चर्बी लगी हुई है, या कुछ अंग्रेज़ सिपाही घोड़ों पर चढ़ कर किसी मसजिद में दाख़िल हो गए हैं। इसके नतीजे में मुसलमानों ने अंग्रेज़ों से जो लड़ाई लड़ी, उसमें लाखों मुसलमान मारे गए। बेशुमार मुसलमानों का ख़ून बहा। मगर सब कुछ बेकार, क्योंकि जो सूरते-हाल थी वह बदस्तूर और भी शिद्दत के साथ बरक़रार रही।

उस वक़्त से लेकर अब तक लड़ाई-भिड़ाई का सिलसिला जारी है। मुसलमान हर तरफ़ अपना ख़ून बहा रहे हैं। ग़ैर क़ौम का कोई शख़्स मसजिद की दीवार पर रंग डाल दे, कोई मसजिद के सामने ग़लत नारे लगा दे, कोई जुलूस बाजा बजाता हुआ मसजिद की सड़क से गुज़र जाए: इस तरह का कोई वाक़िआ हो तो

मुसलमान भड़क कर लड़ जाते हैं। इसके बाद मुसलमानों और ग़ैरमुसलमानों के बीच फ़साद होता है। गोलियां चलती हैं। बेशुमार लोग मारे जाते हैं। इस तरह के झगड़े और लड़ाइयों में मुसलमानों का जो ख़ून बहता है वह इतना ज़्यादा है कि उसको नापने के लिए बाल्टी की नहीं बल्कि ड्रम की ज़रूरत होगी।

मुसलमानों के अपने बयान के मुताबिक सड़कों पर मुसलमानों का ख़ून बह रहा है, बस्तियां मुसलमानों के ख़ून से सुर्ख़ हो रही हैं।

अब देखिए कि यह सारा ख़ून जो बहाया जा रहा है उसका फ़ायदा क्या है? क्या इसकी वजह से ख़ुदा के बंदे ख़ुदा के दीन में दाख़िल हो रहे हैं? क्या इसकी वजह से इस्लाम के दुश्मन इस्लाम के दोस्त बन रहे हैं? क्या इसकी वजह से ऐसा हो रहा है कि क़ौमें और क़बीले इस्लाम में दाख़िल होकर इस्लाम की ताक़त बन जाएं?

ज़ाहिर है कि ऐसा नहीं है। मुसलमानों के ख़ून का सैलाब सौ साल से भी ज़्यादा मुद्दत से बह रहा है। पर एक भी शख़्स नहीं जिसकी रूह को ख़ून के इस दरिया ने पाक किया हो। कोई एक आदमी नहीं जो इस ख़ून की वजह से मुसलमानों के दीन में दाख़िल हुआ हो। कोई एक क़बीला नहीं, जिसने मुसलमानों के इस अमल को देख कर ऐसा किया हो कि वह ख़ुदा की नाफ़रमानी को छोड़ कर ख़ुदा का मोमिन (मानने वाला) और ख़ुदा का मुसलिम (आज्ञाकारी) बन जाए।

यह फ़र्क क्यों है? रिसालत के दौर में पानी ने जो नतीजा दिखाया था, बाद के दौर में ख़ून भी वह नतीजा न दिखा सका। इस फ़र्क की वजह यह है कि रसूल का पानी मुहब्बत का पानी था। और मौजूदा मुसलमानों का ख़ून नफ़रत का ख़ून है। रसूल ने इंसान के ऊपर माफ़ी, ख़ैरख़्वाही, शफ़क़त, प्यार और मेहरबानी की बारिश बरसाई थी। इसके बरअक्स आज के मुसलमानों का हाल यह है कि वे इंसान के ऊपर नफ़रत और ग़ुस्सा और उत्तेजना का ख़ून उंडेल रहे हैं। यही वह फ़र्क है जिसने पहले दौर के अमल का यह नतीजा पैदा किया था कि क़ौमें की

क़ौमें और क़बीले के क़बीले इस्लाम के साए में दाख़िल हो गए। इस्लाम सारी दुनिया का सबसे ज़्यादा ताक़तवर और सबसे ज़्यादा ग़ालिब (प्रभुत्वशाली) दीन बन गया। और मौजूदा ज़माने में इस्लाम सारी दुनिया में हक़ीर (तुच्छ) हो रहा है। वह एक विलियन (एक अरब) मुसलमानों के बावजूद सारी दुनिया का कमज़ोर और मग़लूब (प्रभुत्वहीन) मज़हब बना हुआ।

हर आदमी में पैदायशी तौर पर अलग तरह की सलाहियतें होती हैं। एक नफ़्से-लव्वामा (ज़मीर, अंतरात्मा) और दूसरी नफ़्से-अम्मारा (अनानियत या अंहकार)। ये सलाहियतें पहले सोई होती हैं। अब अगर आप किसी दूसरे के नफ़्से- लव्वामा को जगाएं तो उसकी शख़्सियत का इंसानी जुज़ (मानवीय अंश) आपके हिस्से आएगा, और अगर आप उस नफ़्से-अम्मारा को जगाएं तो उसकी शख़्सियत का हैवानी जुज़ (पाशविक अंश) आपके हिस्से आएगा।

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम की कोशिश हमेशा यह होती थी कि आप आदमी के वजूद के इंसानी हिस्से को जगाएं। इसलिए आप न सिर्फ़ अच्छों के साथ अच्छा सलूक करते थे, बल्कि बुरों के साथ भी आप हमेशा अच्छा सलूक करते थे, इसकी वजह से आदमी की छुपी हुई 'फ़ितरत' जागती और आख़िरकार वह इस्लाम क़ुबूल करके आपका साथी बन जाता था।

मौजूदा मुसलमान रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम की सुन्नत पर अमल नहीं करते कि 'बुरों के साथ भी अच्छा सलूक करो।' वह हमेशा रद्दे-अमल (प्रतिक्रिया) का तरीक़ा अपनाते हैं। इसीलिए उनका तरीक़ा सिर्फ दूसरे की अनानियत और अहंकार को जगाने सबब बनता है। ख़ुदा के बन्दों के लिए उनके पास 'मुहब्बत का पानी' नहीं, अलबत्ता उनके पास 'नफ़रत का ख़ून' काफ़ी मिक़दार में मौजूद है, जिसको वे लोगों के ऊपर उंडेलते रहते हैं।

ऐसे लोगों को ख़ुदा के बाग़ के सिर्फ कांटे मिलेंगे। वे उस बाग़ के फूलों के मालिक नहीं बन सकते। यही क़ुदरत के क़ानून का फ़ैसला हैं।

मुक़ाम कैसे मिला?

हम्ज़ा बिन अब्दुल मुत्तलिब पैग़म्बरे-इस्लाम सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के चचा थे। उनके बारे में इस्लामी इतिहास में लिखा गया है कि हम्ज़ा उन लोगों में से थे, जिनके ज़रिए अल्लाह ने दीन को ताक़त दी (सीरत अल-नबूवत इब्ने कसीर, पहला भाग, पेज 446)। हज़रत हम्ज़ा को यह मुक़ाम ऐसे ही नहीं मिल गया, बल्कि वह उनके सच्चे अमल के नतीजे में उन्हें हासिल हुआ।

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम को जब हुक्म हुआ कि अपने ख़ानदान के क़रीबी लोगों को आगाह करो (अल-शुअरा, 214) तो आपने ख़ास तौर पर हम्ज़ा के सामने दीने-तौहीद पेश किया, मगर उनके ज़ेहन पर बाप-दादा के दीन का इतना असर था कि शुरू में कई साल तक इस्लाम की सच्चाई उनकी समझ में न आ सकी। आख़िरकार नबूवत के छटे साल उन्होंने इस्लाम क़बूल किया।

एक रोज़ वह शिकार खेल कर वापस आए। उन के हाथ में लोहे की कमान थी। ठीक उसी वक़्त एक औरत ने आकर उनसे कहा कि अभी मैंने सफ़ा पहाड़ी के पास मुहम्मद को देखा है। वहां अम्र बिन हिशाम (अबू जहल) भी था और वह तुम्हारे भतीजे को गाली दे रहा था और बहुत ज़्यादा बुरा कह रहा था। हम्ज़ा ख़ानदानी ग़ैरत के तहत घर से निकले काबे में उन्होंने अबू जहल को पा लिया। वह अभी तक ग़ुस्से में थे। उन्होंने लोहे की कमान अबू जहल के सिर पर इतने ज़ोर से मारी कि ख़ून निकल आया। उन्होंने अबू जहल से कहा कि तुम मेरे भतीजे के दुश्मन बने हुए हो, तो सुन लो कि मेरा दीन भी वही है जो मुहम्मद का दीन है। अबू जहल का ताल्लुक़ क़बीला बनू मख़्ज़ूम से था और हम्ज़ा का ताल्लुक़ क़बीला बनू हिशाम से।

घर वापस आए तो क़ौम के कुछ लोग उनसे मिले। उन्होंने हम्ज़ा को शर्म दिलाई कि तुम विधर्मी हो गए। तुमने अपने बाप-दादा के तरीक़े को छोड़ दिया। एक

भतीजे की ख़ातिर तुम क़ौम के तमाम पेशवाओं से कट गए, वग़ैरह। इस तरह की बातों से हम्ज़ा ज़ेहनी कशमकश में पड़ गए। उन्हें शक होने लगा कि शायद मैंने ख़ानदानी हिमायत के जोश में आकर ग़लती कर दी है। वह रात भर बेचैन रहे। उन्हें सारी रात नींद नहीं आई। सुबह हुई तो इसी बेचैनी में काबा में गए। वहां अल्लाह से उन्होंने दुआ कीः

मैंने जो कुछ किया, ऐ अल्लाह, अगर वह हिदायत है तो उसकी तस्दीक़ मेरे दिल में डाल दे। वरना मैं जिस में पड़ गया हूं उससे मेरे लिए निकलने की सूरत पैदा कर दे (पेज 446)।

इसी के साथ अगले दिन वह रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम से मिले। उन्होंने आप से कहा कि मेरे भतीजे, मैं एक मामले में पड़ गया हूं। और उससे निकलने की सूरत मुझे नज़र नहीं आती। मुझे यह भी नहीं मामूल कि यह सही रास्ता है या गुमराही है। इसलिए आप इस मामले में मुझे बताइए। ऐ भतीजे, मैं तुमसे इस मामले में सुनना चाहता हूं। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने उनको नसीहत की। उन्हें ख़ौफ़ दिलाया और उनको अल्लाह के इनाम की ख़ुशख़बरी दी। इसके बाद अल्लाह ने उनके दिल में यक़ीन डाल दिया। उन्होंने कहा कि मैं गवाही देता हूं कि आप सच्चे हैं। ऐ मेरे भतीजे, अपने दीन का आम ऐलान करो। ख़ुदा की क़सम, अगर मुझे वह सब कुछ दिया जाए जिस पर आसमान ने साया किया है, तब भी मैं इस दीन को नहीं छोड़ूंगा (पेज 446)।

इसके बाद हज़रत हम्ज़ा पूरी तरह आप के साथी बन गए। जाहिलीयत (इस्लाम से पहले) के ज़माने में वह एक दौलतमन्द शख़्स थे। इस्लाम में आने के बाद उनकी दौलत ख़त्म हो गई। उन्हें अपने वतन मक्का को छोड़ कर मदीना जाना पड़ा। इस्लाम की ख़ातिर उन्हें अपनी क़ौम से लड़ाई लड़नी पड़ी। यहां तक कि उहुद की जंग में वह शहीद हो गए। फिर भी आख़िर तक वह पूरी वफ़ादारी के साथ रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के साथ रहे।

यह वह बड़ी ख़ुशक़िस्मती है जो हज़रत हम्ज़ा को हासिल हुई। फिर भी यह सौभाग्य उन्हें सादा तौर पर नहीं मिल गया। उन्होंने अपने ग़ैरत के जज़्बात को ख़ुदा के दीन के लिए इस्तेमाल किया। जब शैतान ने उनके अन्दर शक पैदा किया तो उन्होंने उस शक को क़बूल नहीं कर लिया, बल्कि उसके लिए रो-रो कर दुआएं कीं। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम से मिल कर उसकी सफ़ाई मालूम की। और जब बात साफ़ हो गई तो फिर कोई चीज़ उनके लिए एतिराफ़ (स्वीकार) करने में रुकावट नहीं बनी। उन्होंने न सिर्फ़ खुले दिल से एतिराफ़ किया, बल्कि हर नुक़सान और मुसीबत को बर्दाश्त करते हुए बराबर उस पर क़ायम रहे।

यह है हज़रत हम्ज़ा की वह क़ुर्बानी, जिसके नतीजे में सारी दुनिया के मुसलमान हर हफ़्ते जुमा' के ख़ुतबे में 'सैयदुश्शुह्दा हम्ज़ा' कह कर उनकी दीनी बड़ाई का एतिराफ़ करते हैं।

दावत का काम सबसे ज़्यादा क़ीमती है।

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमायाः अल्लाह तुम्हारे ज़रिए से एक आदमी को हिदायत दे दे तो तुम्हारे लिए उन तमाम चीज़ों से बेहतर है जिन पर सूरज तुलूअ (उदय) होता है। (*जामिउ बयानिल इल्म व फ़ज़्लिही*, हदीस नंबर 774)

इज्तिमाई ज़िन्दगी हर हाल में ज़रूरी

अबुद दर्दा' कहते हैं कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम को यह कहते सुना : "जिस गांव या जंगल में तीन आदमी हों और वहां जमाअत से नमाज़ न होती हो तो उन पर शैतान हावी हो जाता है। इसलिए जमाअत को ज़रूरी समझो। भेड़िया अकेली बकरी को खा जाता है और आदमियों का भेड़िया शैतान है।" (*सुनन अबू दाऊद*, हदीस नंबर 547)

बोलने का तरीक़ा

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम का बोलने का तरीक़ा यह था कि आप हमेशा साफ़ अन्दाज़ में बोलते थे और अल्फ़ाज़ को ठहर-ठहर कर अदा करते थे। आपकी अहलिया हज़रत आयशा रज़ी अल्लाहु अन्हा ने बाद के ज़माने के लोगों से फरमायाः

> रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम तुम लोगों की तरह तेज़-तेज़ नहीं बोलते थे, बल्कि आपके कलाम में ठहराव होता था। आप के पास बैठा हुआ आदमी उसको याद कर लेता था (ज़ादुल-मआद)।

एक और रिवायत में ये अल्फ़ाज़ आए हैं:

> रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम इस तरह तेज़-तेज़ बातें नहीं करते थे जैसे तुम करते हो, आप इस तरह बात करते थे कि अगर गिनने वाला गिने तो उसको गिन ले। (*बुख़ारी, मुस्लिम*)

मोमिन का बोलना एक ऐसे शख़्स का बोलना होता है जो अल्लाह से डरने वाला हो। मोमिन को यक़ीन होता है कि उसका हर लफ़्ज़ फ़रिश्ते लिख रहे हैं। वह अपनी कही हर बात के लिए ख़ुदा के यहां जवाबदेह होने वाला है। मोमिन का यह यक़ीन उसके अन्दर ज़िम्मेदारी का एहसास पैदा कर देता है। वह जब बोलता है तो उसको ऐसा महसूस होता है जैसे वह ख़ुदा और फ़रिश्ते के सामने बोल रहा है। यह एहसास उसकी ज़ुबान पर लगाम लगा देता है। वह बोलने से पहले सोचता है। वह जब बोलता है तो अल्फ़ाज़ तोल कर अपने मुंह से निकालता है। ख़ुदा का ख़ौफ़ उससे तेज़-कलामी का अन्दाज़ छीन लेता है। आख़िरत की जवाबदेही का एहसास उसके बोलने के जोश के लिए रुकावट बन जाता है।

जो शख़्स इस क़िस्म के शदीद एहसासों से दबा हुआ हो वह आख़िरी हद तक संजीदा इन्सान बन जाता है। और संजीदा इन्सान की बातचीत का अन्दाज़ वही होता है, जिसका नक़्शा हज़रत आयशा की ऊपर वाली रिवायत में नज़र आता है।

एक सुन्नत

मक्का की फ़तह (8 हिजरी) के बाद रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने मक्का से तायफ़ का सफ़र किया। इस सफ़र के दौरान जो वाक़िआत पेश आए, उनमें से एक वाक़िआ वह है जो इन अल्फ़ाज़ में नक़ल किया गया है:

> फिर आप उस रास्ते में चले जिसे ज़ैक़ा (तंग) कहा जाता था। जब आप उस तरफ़ चले तो आपने उसका नाम पूछा और कहा कि उसका नाम क्या है। आपको बताया गया कि ज़ैक़ा (तंग)। आपने फ़रमाया कि नहीं, बल्कि वह युसरा (आसान) है। (*सीरत इबने हिशाम*)

यह वाक़िआ बताता है कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम का तालीम और तरबियत का तरीक़ा क्या था। वह आदमी के तर्ज़े-फ़िक्र और सोचने के अंदाज़ को बदलना था। लोग जिस चीज़ को ‘मुश्किल’ के रूप में देख रहे हों, उसके बारे में ऐसी नज़र पैदा करना कि वे उसको ‘आसानी’ के रूप में देखने लगें। आज ज़रूरत है कि पैग़म्बर की इस सुन्नत को ज़िंदा किया जाए। लोगों के सोचने के तरीक़े को बदलना और उनके ज़ेहन को दुरुस्त करना, यही आज करने का सबसे बड़ा काम है, इसी काम के करने पर मुस्लिम मिल्लत का मुस्तक़बिल टिका हुआ है।

मौजूदा मुसलमानों ने अपने पैग़म्बर को क़ौमी हीरो की हैसियत दे रखी है। इसके बजाए उनके अन्दर यह ज़ेहन बनाना कि पैग़म्बर एक क़ाबिले तक़लीद (अनुकणीय) मिसाल है। आज मुसलमान अपनी तारीख़ और अपने इतिहास से

फ़ख़्र और गर्व की ख़ुराक ले रहे हैं; इसके बजाए उन्हें तारीख़ से सबक़ लेने वाला बनाना। मुसलमान अपने मसलों को ज़ुल्म की नज़र से देख रहे हैं। इसके बजाए उनको इस क़ाबिल बनाना कि वे उन्हें चेलैंज की नज़र से देखें। मुसलमान दूसरी क़ौमों को अपना शत्रु और प्रतिद्वंद्वी समझे हुए हैं; इसके बजाए उनके अंदर यह निगाह पैदा करना कि वे दूसरी क़ौमों को 'मदऊ' (निमंत्रित) की हैसियत दें और उनके साथ 'दाअीयाना' यानी आमंत्रण और आवाहन वाला अख़लाक़ बरतें। ख़ुलासा यह कि मुसलमानों के अंदर ऐसा फिक्री इन्क़िलाब (वैचारिक क्रांति) लाना कि वे मौजूदा क़ौमी निगाह को छोड़ दें और चीज़ों को रब्बानी निगाह से देखने लगें। आज सबसे बड़ी ज़रूरत यह है कि उस छोड़ी हुई सुन्नत को दोबारा ज़िन्दा किया जाए।

दो इमकानात के दरमयान

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम जब दुआ फ़रमाते तो अक्सर इस क़िस्म के अल्फ़ाज़ फ़रमातेः

> ऐ दिलों को फेरने वाले, मेरे दिल को अपने दीन पर जमा दे। हज़रत आयशा ने एक रोज़ सुना तो कहाः ऐ ख़ुदा के रसूल, आप यह दुआ बहुत करते हैं। इसकी क्या वजह है? आपने फ़रमायाः
>
> हर आदमी का दिल अल्लाह की उंगलियों में से दो उंगली के बीच होता है। जब वह उसको सीधा करना चाहता है तो सीधा कर देता है और जब वह उसको टेढ़ा करना चाहता है तो टेढ़ा कर देता है। (*मुसनद अहमद,* हदीस नंबर 17630)

इससे मालूम होता है कि कोई भी शख़्स गुमराही के ख़तरे से ख़ाली नहीं। हर आदमी को हर वक़्त अपने ईमान की हिफ़ाज़त करनी है। हर वक़्त अल्लाह से यह तौफ़ीक़ मांगनी चाहिए कि वह उसको फिसलने से बचाए। जिस पल

अल्लाह की तौफ़ीक़ आदमी का साथ छोड़ देगी उसी पल वह गुमराही की घाटी में भटक जाएगा। आदमी हर पल हिदायत और गुमराही के बीच है और सिर्फ़ अल्लाह की मदद ही उसको सही राह पर क़ायम रख सकती है।

ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब

इन्सान इन्क़िलाब चाहता है। उसी के साथ वह चाहता है कि यह इन्क़िलाब ग़ैर-ख़ूनी तौर पर आए। मगर इतिहास बताता है कि कोई भी शख़्स ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने में कामयाब न हो सका। तमाम मालूम इन्क़िलाब क़त्ल और ख़ून के जंगल को पार करके ही आए हैं। मुहम्मद सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम का लाया हुआ इन्क़िलाब तमाम मालूम इतिहास का अकेला इन्क़िलाब है जो सही मानो में ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब (bloodless revolution) है। मुहम्मद सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम को अगर इतिहास से हटा दिया जाए तो न सिर्फ़ ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब की यह बात अफ़साना बन कर रह जाती है, बल्कि उसके बाद कोई ऐसी व्यावहारिक मिसाल बाक़ी नहीं रहती जिसकी रोशनी में कोई इन्सान बाद के ज़मानों में ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब की बात सोच सके।

फ्रान्स में आधुनिक लोकतांत्रिक इन्क़िलाब आया। इसमें जनता और राजतंत्र के बीच जो मुक़ाबले हुए उनमें मरने वालों की तादाद 10 लाख तक पहुंच गई। बीसवीं सदी में रूस में कम्यूनिस्ट इन्क़िलाब आया। उसमें जो लोग मरे और मारे गए उनकी ठीक-ठीक तादाद मालूम नहीं। फिर भी अन्दाज़ा है कि उनकी तादाद किसी हाल में एक करोड़ से कम नहीं। अमरीकी इन्क़िलाब (1773-1783) में इससे कुछ कम आदमी मरे। फिर भी इसमें मरने वालों की तादाद 50 हज़ार तक पहुंच गई। विश्व युद्धों का मामला इससे भी आगे है। पहले विश्व-युद्ध में विभिन्न मुल्कों के 75 लाख आदमी मारे गए। और दूसरे विश्व-युद्ध में छः करोड़ से ज़्यादा आदमी मरे।

मुहम्मद सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम इस दुनिया से गए तो एक पूरे मुल्क में ज़बरदस्त वैचारिक और नैतिक इन्क़िलाब आ चुका था। आपकी वफ़ात के वक़्त 12 लाख वर्ग मील के क्षेत्र पर आपकी हुकूमत क़ायम थी। मगर इस पूरी प्रक्रिया में सिर्फ़ 1018 आदमी मरे, जिनमें 259 मुसलमान थे और 759 ग़ैरमुस्लिम। यह तादाद घटना को देखते हुए इतनी कम है कि वह लगभग नहीं के बराबर है। आपके लाए हुए इन्क़िलाब को बेशक पूरे मा'नों में ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िालाब कहा जा सकता है।

हर लीडर ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने का दावा करता है। मगर कोई लीडर ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िालाब लाने में कामयाब नहीं होता। इसकी वजह क्या है? इसकी वजह यह है कि दुनिया में ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने के लिए ख़ुद अपने आपको ख़ून करना पड़ता है। और यही वह क़ीमत है जिसके देने के लिए कोई शख़्स तैयार नहीं। ख़ूनी इन्क़िलाब टकराव की ज़मीन पर आते हैं और ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब सब्र और संयम की ज़मीन पर, और किसी इन्सान के लिए सब्र से ज़्यादा मुश्किल काम इस दुनिया में कोई और नहीं।

सब्र की हक़ीक़त झटके को अपने ऊपर लेना है, दूसरे पर डालने के बजाए अपने आप पर सहना है। हक़ीक़त यह है कि लड़ाई के बग़ैर भी जीत होती है। मगर लड़ाई के बग़ैर जीतने के लिए अपने आप से लड़ना पड़ता है। लोग अपने आप से लड़ नहीं पाते, इसलिए वे लड़ाई के बग़ैर लड़ाई जीतने वाले भी नहीं बनते।

मुहम्मद सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने में किस तरह कमियाब हुए, इसका अन्दाज़ा आपकी ज़िन्दगी के हालात को पढ़ने से होता है। मक्का में 13 साल तक आपके विरोधियों ने आपको और आपके साथियों को हर तरह की तकलीफ़े पहुंचाई। उन्होंने अल्फ़ाज़ की चोट भी दी और पत्थर और तलवार की चोट भी। मगर इस तरह की बेशुमार घटनाओ के बावजूद मुहम्मद सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने एक बार भी जवाबी प्रतिक्रिया नहीं ~~की~~ दी। न

किसी से कोई लड़ाई की। आप विरोधियों के हर वार को यकतरफ़ा तौर पर सहते रहे। उनकी तरफ़ से हर क़िस्म के भड़काव के बाजूद कभी भड़के नहीं।

इसके बाद आपने यह किया कि मक्का को छोड़ कर ख़ामोशी के साथ मदीना चले गए। आपने न इसके ख़िलाफ़ फ़रियाद की कि आपको आपके साथियों को अपने वतन और अपनी जायदाद को छोड़ना पड़ रहा है और न इसकी परवा की कि इस तरह वतन छोड़ कर जाने की वजह से लोग आप पर बुज़दिली और फ़रार का इलज़ाम लगाएंगे।

मदीना चले जाने के बाद मक्का के लोगों ने आपके ख़िलाफ़ जंग छेड़ दी। उस वक़्त भी आपकी पालिसी यह रही कि जहां तक हो सके जंग से बचा जाए। मिसाल के तौर पर अहज़ाब के मौक़े पर आपने खाई खोद कर अपने और अपने दुश्मनों के बीच आड़ क़ायम कर दी। आपने सिर्फ़ बचाव (डिफेंस) में जंग की और वह भी उस वक़्त जबकि मुठभेड़ के सिवा कोई और सूरत बाक़ी न रह गई हो। ऐसी बाक़ायदा जंगे सिर्फ़ तीन हैं जिनमें आप ख़ुद शरीक रहे हों (बद्र, उहुद और हुनैन)। आपके ज़माने में मूता की जंग भी हुई मगर उसमें आप ख़ुद शामिल न थे।

आपको अरब में जो ताक़त हासिल हुई वह जंग के ज़रिए नहीं हुई। बल्कि उस सुलह के ज़रिए हुई, जिसको क़ुरआन में फ़त्ह-मुबीन यानी खुली-जीत (अल-फ़त्ह) कहा गया है। सुलह-हुदैबिया का वाक़िआ ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने के लिए अपने आपको ख़ून करने से कम न था। आपने अपनी ज़ात का 'ख़ून' करना गवारा किया ताकि बाहर की दुनिया में ख़ून न बहाया जाए।

पैग़म्बरे इस्लाम सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम को अरब में जो ताक़त हासिल हुई वह जंग के ज़रिए नहीं बल्कि दावत के ज़रिए हासिल हुई। इसी दावत के बन्द दरवाज़ों को खोलने के लिए आपने यह किया कि दुश्मन से उसकी अपनी शर्तों पर सुलह कर ली। यह सुलह हुदैबिया थी जिसको क़ुरआन में खुली फ़त्ह

कहा गया है। सुलह हुदैबिया इस बात का एक ऐतिहासिक सबूत है कि जंग के मुक़ाबले में अम्र की ताक़त बहुत ज़्यादा है। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने हुदैबिया की यकतरफ़ा सुलह के ज़रिए इसी महान हक़ीक़त का अमली रूप दिखाया है, फिर भी यह कोई सादा बात नहीं। इस क़िस्म की एक घटना को अमली रूप देने के लिए सब्र की ज़रूरत है, और इस दुनिया में बेशक सब्र से ज़्यादा मुश्किल क़ुरबानी और कोई नहीं।

मे'यार को बुलन्द करना

पुराने ज़माने के अरब में बराबर की अख़्लाक़ियात (नैतिकता) का रिवाज था। उनकी ज़िन्दगी का उसूल यह था कि जो शख़्स जैसा करे उसके साथ वैसा ही किया जाए। यानी अच्छा सुलूक करने वाले के साथ अच्छा सुलूक और बुरा सुलूक करने वाले के साथ बुरा सुलूक। इस्लाम से पहले के ज़माने का एक शायर अपने मुक़ाबिले के क़बीले के बारे में कहता है कि ज़्यादती की कोई क़िस्म हमने बाक़ी नहीं छोड़ी। उन्होंने हमारे साथ जैसा किया था वैसा ही हमने उनको बदला दिया।

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम तश्रीफ़ लाए तो आपने अख़्लाक़ के इस उसूल को बदला। बराबरी के अख़्लाक़ के बजाय आपने उनको बुलन्द अख़्लाक़ी की तालीम दी। आपने फ़रमाया कि "जो शख़्स तुम्हारे साथ बुरा सुलूक करे उसके साथ तुम अच्छा सुलूक करो।" (*कंज़ुल उम्माल*, हदीस नंबर 6929) एक और हदीस में है:

तुम लोग इम्मआ (मौक़ापरस्त-ख़ुदगर्ज़) न बनो, कि यह कहने लगो कि अगर लोग हमारे साथ अच्छा करें तो हम भी उनके साथ अच्छा करेंगे। और अगर वे ज़्यादती करें तो हम भी ज़्यादती करेंगे। बल्कि अपने आपको इसके लिए तैयार करो कि लोग तुम्हारे साथ अच्छा करें तो तुम उनके साथ अच्छा करोगे और

अगर लोग तुम्हारे साथ बुरा करें तब भी तुम उनके साथ ज़्यादती नहीं करोगे। (*सुनन अल-तिर्मिज़ी,* हदीस नंबर 2007)

आपकी एक सुन्नत यह भी है कि लोगों के शुऊर (चेतना) को बुलन्द किया जाए। उनके अख़्लाक़ को ऊंचा किया जाए। उनकी हालत को हर लिहाज़ से ऊपर उठाने को कोशिश की जाए।

इन्सान के इन्सानी में'यार को बुलन्द करना, फ़िक्री, इल्मी, अख़्लाक़ी हैसियत से उसको ऊपर उठाना अहमतरीन काम है। इसमें आदमी की भलाई है और इसी में पूरे समाज की भलाई भी। यह ठीक रसूल का तरीक़ा है यानी सुन्नते रसूल है और इसको ज़िन्दा करना सुन्नते-रसूल को ज़िन्दा करना है।

कम बोलना, किसी से शिकायत न होना

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के एक सहाबी का इंतिक़ाल होने लगा। लोग उनके पास आए तो देखा कि उनका चेहरा चमक रहा है। लोगों ने वजह पूछी तो उन्होंने कहा, "मेरे पास मेरे आमाल में सबसे ज़्यादा भरोसे की मेरी दो आदतें हैं। एक यह कि मैं बेफ़ायदा बात नहीं करता था। दूसरे यह है कि मेरा दिल मुसलमानों के मामले में बिल्कुल साफ़ था। (*जामे 'उल उलूम*)

जिसकी शरारत का असर उसके बाद भी रहे

एक हकीम का कहना है कि बरकत उसके लिए है कि जब वह मरा तो उसके गुनाह भी उसके साथ मर गए। और तबाही उसके लिए है कि जब वह मरे तो उसके बाद उसके गुनाह भी बाकी रहें।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

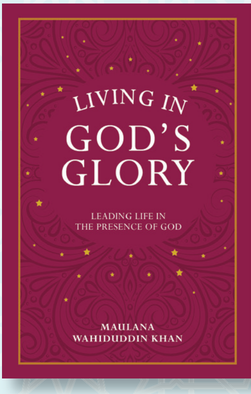

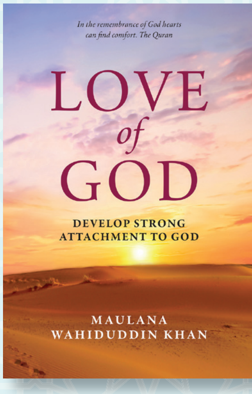

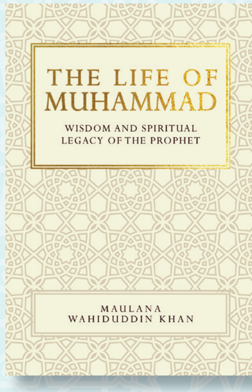

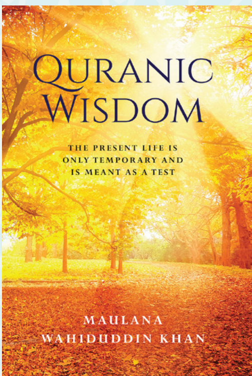

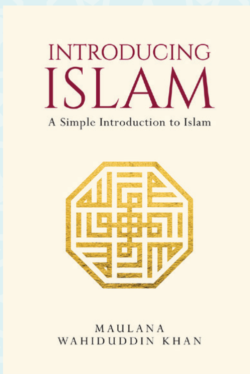

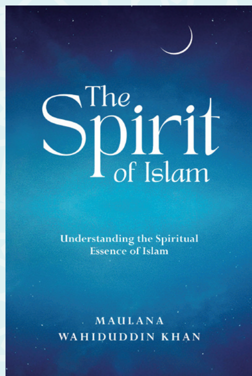

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23